طلوعِ اسلام

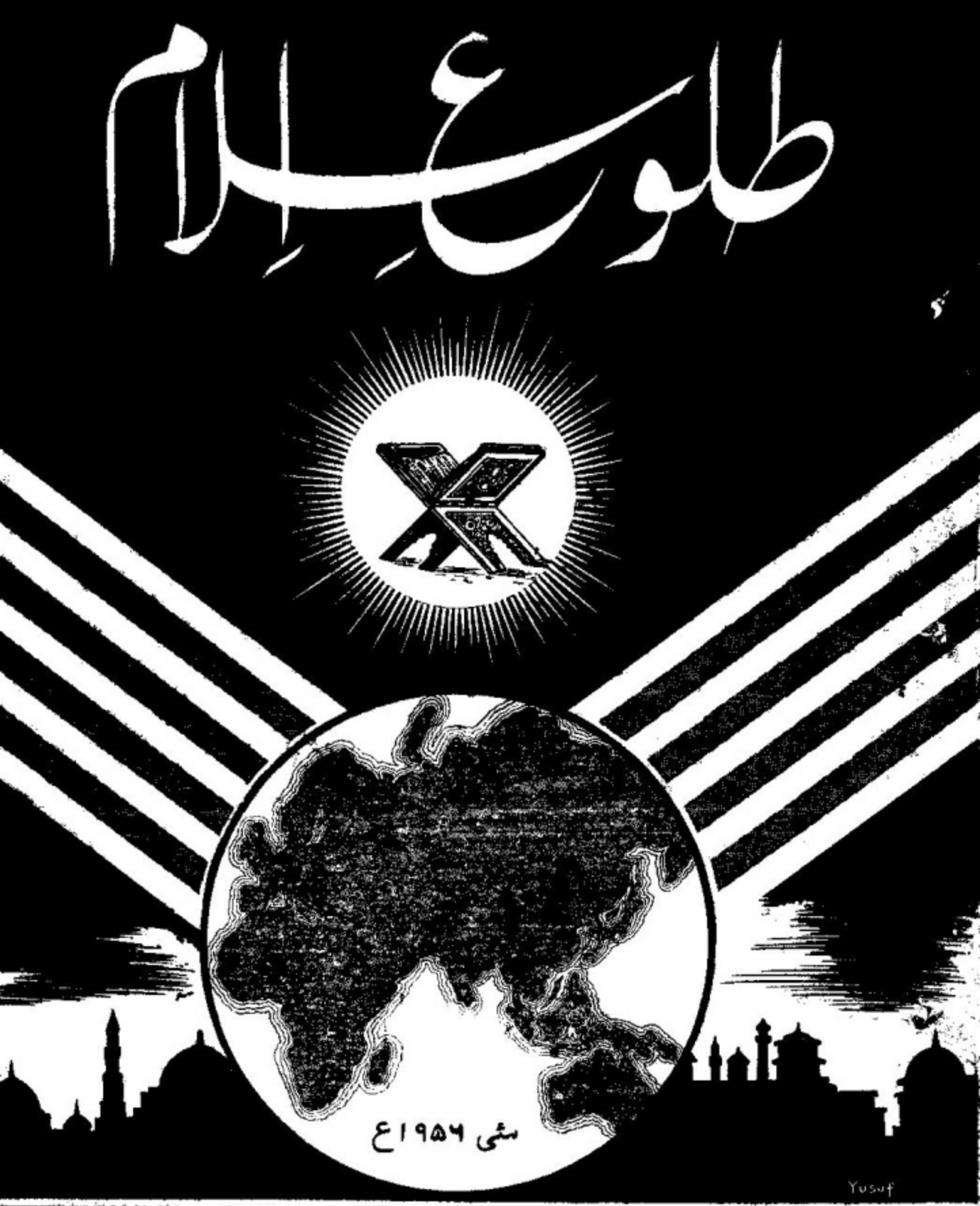

مئی ۱۹۵۶ء

Yusuf

ادارہ طلوعِ اسلام

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

کراچی

قیمت فی پرچہ: پاکستان سے بارہ آنے، ہندوستان سے بارہ آنے

ٹیلی فون نمبر ۴۱۴۸۸

بدل الاشتراک: ہندوستان اور پاکستان سے سالانہ ۔/۸ آٹھ روپے۔ غیر ممالک سے سالانہ ۲۰ شلنگ

جلد ۹ | مئی ۱۹۵۶ء | نمبر ۴

فہرست مضامین

لمعات	۲ — ۸
دستورِ پاکستان	۹ — ۲۶
اسلام کی سرگذشت	۲۷ — ۳۴
مجلسِ اقبال	۳۵ — ۴۴
باب المراسلات	۴۵ — ۵۰
نقد و نظر	۵۱ — ۵۴
ستیزہ	۵۵ — ۶۴
ہمارے بابا	۶۵ — ۶۸
اشتہارات	

دفتر کا پتہ:- ۳/۱۵۹ - ایل - پی - ای - سی - ایچ سوسائٹی - کراچی ۲۹

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

پنڈت جواہر لال نہرو نے پھر کہدیا کہ کشمیر ہندوستان کا حصہ ہے۔ اس لئے وہاں استصواب کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اور ہمارے ہاں پھر فضا میں ایک ارتعاش پیدا ہوگیا۔ سوال یہ ہے کہ کیا نہرو نے ایسا پہلی مرتبہ کہا ہے جو اس کا بیان ہمارے لئے اس طرح باعثِ تعجب اور وجۂ اضطراب ہو رہا ہے؟ اس میں شبہ نہیں کہ عوام کا حافظہ بہت کمزور ہوتا ہے لیکن ہمارا خیال ہے کہ کشمیر کا مسئلہ ایسا نہیں کہ اس آٹھ سال کے عرصہ میں اس کے متعلق جو کچھ ہوتا چلا آیا ہے اسے عوام نے اس قدر جلد فراموش کر دیا ہو۔ ہندوستان، پاکستان کے متعلق جو کچھ کر رہا ہے ایک متعین پالیسی اور طے شدہ پروگرام کے مطابق کر رہا ہے۔ کشمیر کے متعلق اس نے پہلے دن سے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اسے جوناگڑھ، مناوور اور حیدر آباد کی طرح ہتھیا لے گا۔ لیکن چونکہ یہ ذرا سخت ہڈی تھی اسے ہضم کرنے کے لئے اسے وقت درکار تھا۔ اس آٹھ سال کے عرصہ میں اس کی تمام حیلہ تراشیاں اور بہانہ سازیاں اسی مقصد کے حصول کے لئے تھیں۔ اقوامِ متحدہ کی طرف مراجعت۔ ایڈمنسٹریٹر کا تقرر اور تعطل۔ سکیورٹی کونسل۔ باہمی مذاکرات سے معاملہ کا تصفیہ۔ تقسیم کی تجویز اور استصواب وغیرہ سب خواب آور دوائیاں تھیں۔ جو وہ یکے بعد دیگرے پاکستان کو کھلاتا چلا گیا۔ لیکن اس کے یہ عزائم ایسے گہرے اور دبیز پردوں میں چھپے ہوئے نہیں تھے جو دیکھنے والوں کو نظر نہ آسکتے۔ وہ جو کچھ کر رہا تھا اسے اندھے بھی دیکھ سکتے اور بہرے بھی سن سکتے تھے۔ اس لئے یہ کہنا کہ ہم اس کی ظاہرداری دیانتداری کے فریب میں آگئے اور ہمیں معلوم نہ ہو سکا کہ اس کے دلی ارادے کیا ہیں؛ اگر فریبی نہیں تو فریبِ نفس ضرور ہے۔ ہمارے ہاں سب جانتے تھے کہ اس باب میں ہندوستان کے عزائم کیا ہیں۔ اور وہ کس طرح مرورِ زمانہ سے اپنی تقویت کا سامان بہم پہنچاتا چلا جا رہا ہے۔ اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ وہ اسے نہیں جانتا تھا تو اس قسم کی سطحی نگاہ رکھنے والے کو حق نہیں پہنچتا تھا کہ وہ زمامِ اقتدار اپنے ہاتھ میں لے کر ملک کو اپنی معصوم حماقت اور طفلانہ سادہ لوحی کی بھینٹ چڑھائے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایسے اہم عقدوں کی کشود کے لئے جس قسم کی دوربینانہ فراست اور قلندرانہ جرأت درکار ہوتی ہے اس کا ہمارے ہاں فقدان تھا لیکن اس کے کھلے کھلے اعتراف کی بجائے ذمہ دار حضرات میں سے ہر ایک کی کوشش یہ رہی کہ کسی نہ کسی طرح بات ٹلتی رہے تاکہ یہ تصفیہ اُن کے وقت میں نہ اٹھے۔ کسی اور کے زمانہ میں اُبھرے۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ ہم آج اس مقام پر آ کر

کھڑے کر دیئے گئے ہیں۔ جہاں نہ "جائے ماندن نہ پائے رفتن" کا روح فرسا منظر نگاہ کے سامنے آگیا ہے۔

مسئلہ کشمیر کی اہمیت ایسا موضوع نہیں جس پر تفصیل سے کچھ لکھنے کی ضرورت ہو۔ علاوہ اس کے کہ کشمیر پاکستان کے لئے رگِ جان کی حیثیت رکھتا ہے، اس خطہ زمین کی پچاسی فیصدی آبادی (مسلمانوں) کو حق خود اختیاری سے بنوک شمشیر محروم رکھنا، دنیائے اخلاق وتہذیب میں اتنا بڑا جرم ہے کہ بھارت کو اس سے باز رکھنے کے لئے پاکستان کو اپنے خون کا آخری قطرہ تک بہا دینا چاہیئے۔ اگلے دنوں محترم وزیر اعظم (پاکستان) نے اپنی ایک تقریر میں کہا (اور محترم وزیر خارجہ نے اس کا اعادہ کیا) کہ پاکستان کے مقابلہ میں ہندوستان کے پاس سامانِ حرب وضرب، اسباب رسل ورسائل، وسائل پیداوار، ذرائع معیشت، آلاتِ صنعت وحرفت، آبادی، رقبہ، دولت سب کچھ زیادہ ہے اس لئے پاکستان، ہندوستان کے خلاف جارحانہ کارروائی کا خیال بھی نہیں کر سکتا۔ یہ درست ہے لیکن ان بیانات میں ایک بہت بڑا سہو ہو گیا۔ ہمیں ہندوستان کو (اور اس کے بعد ساری دنیا کو) بتانا یہ چاہیئے کہ یہ ٹھیک ہے کہ جہاں تک مادی اسباب وذرائع کا تعلق ہے، پاکستان ہندوستان کے مقابلہ میں کمزور ہے لیکن اخلاقی طور پر پاکستان کا موقف اتنا قوی ہے کہ ہندوستان کی ساری مادی قوتیں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم نے ابھی تک اس کا کماحقہٗ احساس نہیں کیا کہ کسی معاملہ میں اخلاقی طور پر حق بجانب ہونے میں کتنی بڑی قوتیں پوشیدہ ہوتی ہیں۔ قرآن نے جب کہا تھا کہ تمہارے سو آدمی فریق مقابل کے ہزار آدمیوں پر بھاری ہوں گے تو اس نے اسی اخلاقی قوت کی طرف اشارہ کیا تھا۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہم اپنے عوام میں اس اخلاقی قوت کی بیداری اور نمود کے لئے بھی کچھ نہ کر سکے۔ حالانکہ یہ حقیقت کسی سے پوشیدہ نہیں کہ ہمارے عوام میں اس قسم کی صلاحیتیں ہندوؤں کے عوام کے مقابلے میں کہیں زیادہ اور بہتر ہیں۔ اصل یہ ہے کہ ہمارے ہاں پارٹی بازی کی لعنت ایسی شدت اختیار کر گئی ہے کہ ہمارے اربابِ حل وعقد کا سارا وقت جوڑ توڑ کی نذر ہو جاتا ہے اور تعمیری کاموں کے لئے انہیں فرصت ہی نہیں ملتی۔

بہرحال، سوال یہ ہے کہ جس مقام پر ہم اس وقت کھڑے ہیں اس میں ہمارے لئے کشاد کی راہ کیا ہے؟ اس میں شبہ نہیں کہ جہاں تک سامانِ حرب وضرب اور دیگر وسائل وذرائع کا تعلق ہے ہم ہندوستان کے مقابلہ میں پیچھے ہیں۔ لیکن دورِ حاضرہ کی سیاست کا انداز یہ ہے کہ دنیا کی کوئی قوم بھی (خواہ وہ کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو) دوسروں کے مقابلہ میں خود مکتفی نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی ہر چھوٹی بڑی قوم کو اپنے حلیف تلاش کرنے پڑتے ہیں۔ اپنی اندرونی صلاحیتوں کے ساتھ جس قوم کے حلیف اچھے ہوں گے وہی قوم طاقتور سمجھی جائے گی۔ اس کا انحصار قوم کی خارجی پالیسی پر ہوتا ہے۔ ہمیں اس امر کا بلا تامل اعتراف کر لینا چاہیئے کہ اس وقت تک ہم اپنے صحیح خارجی تعلقات استوار کرنے میں بری طرح ناکام رہے ہیں۔ سب سے پہلے تو دیکھئے کہ ہمارے دائیں اور بائیں اس قدر وسیع اسلامی ممالک پھیلے ہوئے ہیں۔ ایک طرف مراکش تک کا وسیع وعریض خطہ۔ دوسری طرف انڈونیشیا کی عظیم اسلامی مملکت۔ لیکن غور کیجئے کہ ان تمام ممالک میں کتنے ایسے ہیں جن کی دوستداری پر ہم پورا بھروسہ کر سکتے ہیں۔ مسلم ممالک کے بعد غیر مسلم حکومتوں کو لیجئے تو ان میں سے کتنی ہیں جو ہندوستان کے مقابلہ میں دل سے ہماری طرفدار ہیں؟ روس کے مقابلہ میں امریکہ سے فوجی امداد لینے کا فیصلہ یقیناً بہتر تھا لیکن واقعات نے بتا دیا ہے کہ امریکہ صرف فوجی امداد کی حد تک ہمارے ساتھ ہے۔ جہاں کسی معاملہ میں ہندوستان کے ساتھ تصادم کا سوال پیدا ہو وہ ہمارا ساتھ نہیں دیتا خواہ ہم کتنے

ہی حق بجانب کیوں نہ ہوں۔ روس ہمارا حلیف نہیں ہو سکتا، اس لئے کہ اس کی رفاقت اشتراکی اثرات سے مشروط ہوتی ہے۔ اور ہم اشتراکیت کے فلسفہ کو کبھی قبول نہیں کر سکتے۔ اگر وہ اپنی حکمت عملی کو بدل لے اور سیاسی تعلقات کو اپنے اشتراکی تصورات سے متاثر نہ کرے تو بات اور ہے۔ ان حالات میں ہم سمجھتے ہیں کہ چین ایک ایسا ملک ہے جس کے اشتراکی تصورات "مذہبی جنون (FANATICISM) کی حد تک نہیں پہنچے۔ اس لئے اس سے سیاسی اتحاد میں اشتراکی جراثیم کے دخیل کار ہونے کا اندیشہ نہیں۔ اگر چین کے ساتھ آبرومندانہ طور پر ہمارا سیاسی اتحاد ہو جائے تو ہمارے نزدیک یہ اقدام ہمارے لئے مفید رہے گا۔ ہم اس وقت اس مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر تفصیلی گفتگو کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتے لیکن ہمارا خیال ہے کہ عالمی سیاست کی بساط جن لوگوں کی نگاہوں کے سامنے ہے وہ ہم سے متفق ہوں گے کہ چین کے ساتھ ہمارا سیاسی اتحاد بڑے دور رس نتائج کا حامل بن سکتا ہے۔

اس کے ساتھ ہی افغانستان کی نزاعی گتھی کو سلجھانے کی طرف بھی ہمیں زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ افغانستان اس وقت بڑی غلط فہمیوں میں مبتلا ہے جن کی وجہ سے وہ حقائق کو ان کے اصلی رنگ میں دیکھ نہیں سکتا۔ لیکن اس کے باوجود ہمارا خیال ہے کہ اس مسئلہ کو سلجھایا جا سکتا ہے۔ مسئلہ کشمیر کے حل کے لئے افغانستان کے ساتھ ہماری موجودہ کشمکش کا ختم ہونا نہایت ضروری ہے۔

لیکن ان سب سے کہیں زیادہ ضروری یہ ہے کہ ملک کے معاشرتی اور معاشی حالات جو دن بدن خراب سے خراب تر ہوتے چلے جا رہے ہیں انہیں کس طرح سدھارا جائے۔ جہاں تک ہمارے معاشرتی حالات کا تعلق ہے زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جس میں ناسور نہ پڑ چکے ہوں۔ باقی رہا ہمارا معاشی نظام سو اس کی حالت اور بھی زبوں ہے۔ ملک میں سرمایہ داری کا وہ ملعون نظام مستحکم سے مستحکم تر ہوتا چلا جا رہا ہے جو یورپ میں آج سے دو تین سو سال پہلے کارفرما تھا۔ اور جس نے اسے تباہیوں کے جہنم میں دھکیل دیا ہے۔ ملک کی ساری دولت گنتی کے چند گھرانوں میں سمٹتی چلی جا رہی ہے اور نچلے اور اوپر کے طبقہ میں اتنا بُعد پیدا ہو گیا ہے کہ ان میں کوئی قدر مشترک نظر ہی نہیں آتی۔ مختصراً آج ہماری حالت وہ ہے جس کا نقشہ بہت پہلے اقبال نے ان الفاظ میں کھینچا تھا کہ

خلق خدا کی گھات میں رند و فقیہہ و میر و پیر — تیرے جہاں میں ہے وہی گردشِ صبح و شام ابھی
تیرے امیر مال مست تیرے غریب حال مست — بندہ ہے کوچہ گرد ابھی خواجہ بلند بام ابھی
دانش و دین و علم و فن، بندگیٔ ہوس تمام — عشق گرہ کشائے کا فیض نہیں ہے عام ابھی

"عشق گرہ کشائے کا فیض عام" کرنے کے لئے بڑے باہمت انسان کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسے باہمت انسان کی جو بلا ادنیٰ تامل نوکِ نشتر کو ناسور کی گہرائیوں تک لے جائے اور مریض کی چیخ پکار اس کی گرفت کو ذرا سا بھی ڈھیلا نہ ہونے دے۔ ہمارے ناسوروں کا علاج اسی قسم کے معاشرتی و معاشی آپریشن سے ہو سکتا ہے۔ مرہم پٹی سے نہیں۔ جب تک یہ نہیں ہوتا، ہم اپنے عوام کے اندر ان قوتوں کو بیدار نہیں کر سکتے جو ہندوستان کے مادی سازوبراق کی زیادتی کی حریف ہو کر اسے بتا دے کہ

بے دست و پائیم کہ ہنوز از ذوقِ عشق
سوداست در سرم کہ بہ ساماں برابر است

اور دنیا ایک بار پھر یہ تماشا دیکھ لے کہ — مومن ہو تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی۔

ہمارے لئے اپنی خارجی حکمت عملی کی اصلاح و استواری کے ساتھ ساتھ ان داخلی کمزوریوں کا علاج بھی نہایت ضروری ہے۔

---

(۲)

مسلم لیگ

آپ نے شیخ چلی کا وہ قصہ سنا ہے کہ اس نے اپنے آپ کو کمرے میں بند کر لیا۔ اندر سے کنڈی لگا لی۔ اور پھر خود ہی رونے لگ گیا کہ میں باہر کیسے نکلوں! شیخ چلی کسی خاص زمانے میں خاص مقام پر پیدا نہیں ہوا تھا۔ یہ ہر زمانے میں ہر جگہ موجود ہوتے ہیں، کہیں کم، کہیں زیادہ۔ پاکستان میں ان کا خاصا زور ہے اور ان کی اکثریت ارباب مسلم لیگ میں ملتی ہے۔

مسلم لیگ اپنی موت مر رہی تھی۔ اس کی یاد قصۂ پارینہ ہو چلی تھی۔ اس کی وجہ سے پیدا شدہ جھگڑے جھیلے بھی رفتہ رفتہ ختم ہو رہے تھے کہ نہ معلوم دفعۃً بعض لوگوں کے جی میں کیا آیا کہ انھوں نے کراچی میں لیگ کا جلسہ رچایا اور اس میں سردار عبدالرب نشتر کو اس کا صدر منتخب کر کے پھر اس سوتے فتنے کو جگا دیا۔ نشتر صاحب کے انتخاب پر چاروں طرف سے نعرہ ہائے تبریک و تہنیت بلند ہوئے۔ یوں محسوس ہوا گویا پاکستان نے اس فردوسِ گم گشتہ کو پھر سے پالیا ہے جس کی تلاش میں جنت سے نکالا ہوا آدم اس طرح مارا مارا پھر رہا تھا۔

لیکن ابھی ان نعروں کی صدائے بازگشت بھی فضا کی پہنائیوں میں گم نہ ہونے پائی تھی کہ خود انہی حضرات کی طرف سے چیخ پکار بھی شروع ہو گئی کہ مسلم لیگ خواہ مخواہ حکومت کی چلتی گاڑی میں روڑے اٹکاتی ہے۔ اور صدر مسلم لیگ اپنے آپ کو وزیر اعظم سے بھی اونچا سمجھتے ہیں۔ دوسری طرف نشتری گروہ ہے جس کا دعویٰ یہ ہے کہ پارٹی حکومت میں، پارٹی کے صدر کی حیثیت بادشاہ گر کی ہوتی ہے۔ پارلیمان کے اندر پارٹی اور اس کے لیڈر کو صدر کی مرضی کے مطابق چلنا چاہیئے۔ چنانچہ دونوں پارٹیاں اب میدان میں اتر آئی ہیں، اور ایک دوسرے کو زک دینے کے لئے ہر ممکن حربہ استعمال کر رہی ہیں۔ اس طوفانِ بدتمیزی میں نہ صدر مملکت کے احترام کا خیال رکھا جا رہا ہے نہ وزیر اعظم کے مقام کا پاس۔ نہ کوئی صوبے کے گورنر کو بخشتا ہے نہ وزیر اعلےٰ کو۔ یہ سب کچھ اس وقت شروع ہو گیا تھا جب دنیا کے چالیس ممالک کے نمائندے اسلامیہ جمہوریہ پاکستانیہ کے جشنِ جمہوریت میں شرکت کے بعد ہنوز اپنے اپنے ملکوں میں واپس نہیں پہنچے تھے۔ اور اس موقعہ پر ہو رہا ہے جب بھارت پاکستان کی سرحدوں پر فوجیں جمع کر رہا ہے اور کشمیر کا مسئلہ اپنے نازک ترین دور سے گذر رہا ہے۔

لیکن جو کچھ ہو رہا ہے نہ خلاف توقع ہے نہ غیر معقول۔ یہ لازمی نتیجہ ہے پارٹی بازی کا اور گروہ بندی کا جسے قرآن نے انسانیت کی سب سے بڑی لعنت قرار دیا ہے۔ قارئین کو یاد ہوگا کہ تشکیل پاکستان کے بعد طلوع اسلام نے سب سے پہلے جو آواز اٹھائی تھی وہ یہ تھی کہ اب مسلم لیگ کو ختم کر دینا چاہیئے اور اس کے ساتھ ہی ملتِ اسلامیہ میں پارٹیوں کے وجود کو قانوناً ممنوع قرار دیدینا چاہیئے۔ ہم نے کہا تھا کہ ہندوستان

میں دو قومیں بستی تھیں۔ ایک مسلم اور دوسری غیر مسلم۔ وہاں اس کی ضرورت تھی کہ مسلم قوم کی نمائندہ جماعت الگ ہو۔ یہ جماعت مسلم لیگ کی تھی۔ حصول پاکستان کے بعد وہ مقصد ختم ہو گیا جس کے لئے مسلم لیگ وجود میں آئی تھی۔ اب یہاں پوری کی پوری ملت ایک جماعت کی حیثیت رکھتی ہے اس لئے ملت کے اندر کسی پارٹی یا جماعت کی ضرورت نہیں۔ ملت کے اندر مختلف پارٹیوں کے وجود کو قرآن شرک قرار دیتا ہے۔ اگر ہم نے مسلم لیگ کو اسی طرح زندہ اور قائم رکھا تو دوسری پارٹیوں کو اپنے وجود اور بقا کے لئے سند مل جائے گی اور ملت پارٹیوں میں بٹ کر تباہ ہو جائے گی۔ اسلام توحید کا پرستار ہے اس لئے اس کی ملت وحدت کی مظہر ہر وہ کوشش جو ملت کی وحدت کو توڑے غیر اسلامی ہے اس لئے اب مسلم لیگ کو باقی رکھنے کی کوشش کرنا غیر اسلامی اقدام ہے لیکن طلوع اسلام کی اس آواز کو کسی نے نہ سنا اور مسلم لیگ کو پاکستان کی بخشندہ۔ قائد اعظم کا ترکہ اور نہ معلوم کیا کیا القاب عطا کر کے ایک "مقدس بت" بنا دیا گیا۔ مقصد صرف یہ تھا کہ وہ انگور کی بیلیں جو اپنے بل بوتے پر کھڑی نہیں ہو سکتیں۔ اس شاہ بلوط کے سہارے قائم رہ سکیں۔ اس ۸ سال کے عرصہ میں مسلم لیگ نے (اور اس کی تقلید میں ملک کی دوسری پارٹیوں نے) ملت میں جس قدر تشتت و انتشار پیدا کیا ہے وہ کسی چشم بینا سے پوشیدہ نہیں۔ اس باب میں مسلم لیگ خصوصیت سے اس لئے پیش پیش رہی ہے کہ باقی پارٹیاں اقتدار کے حصول کے لئے کوشاں تھیں لیکن اس پارٹی کے ہاتھ میں اقتدار اور وزارت کی کرسیاں تھیں۔ ان کرسیوں کے حصول اور تقسیم کے لئے عجیب عجیب قسم کے حربے استعمال کئے جاتے تھے۔ کبھی فیصلہ ہوتا کہ صدر مسلم لیگ اور وزیر اعظم کا منصب ایک ہی شخص کے پاس ہونا چاہیئے۔ کبھی طے پاتا کہ نہیں! مسلم لیگ کے کسی عہدیدار کو حکومت کا کوئی منصب قبول نہیں کرنا چاہیئے۔ کبھی غیر لیگیوں کو راز دروں میخانہ کی شرکت کا اہل قرار دیا جاتا۔ اور کبھی انہیں اچھوت قرار دے کر نکال باہر کیا جاتا۔ مختصر یہ کہ اس ۸ سال میں یہی تماشے ہوتے رہے اور ملت ٹکڑوں ٹکڑوں میں بٹتی چلی گئی۔ (سابقہ) محمد علی وزارت کے ٹوٹنے کے بعد مسلم لیگ گمنامی کے گوشے میں چلی گئی تھی اور حساس قلوب نے اطمینان کا سانس لیا تھا کہ یہ عروس ہزار داماد اب ابدی نیند سو جائے گی۔ لیکن قوم کی بدنصیبی کہ اس مردہ لاش کو پھر اکھیڑا گیا اور انہی نشتر صاحب کو جنہیں مسلم لیگی وزارت سے باہر نکالا گیا تھا، اس کا صدر بنا دیا گیا۔ اب وہ "الہ دین کا دیو" دوبارہ بوتل میں بند ہونا نہیں چاہتا اور شیخ چلی کہرام مچا رہے ہیں۔ ان بھلے آدمیوں سے پوچھئے کہ آپ سے کہا کس نے تھا کہ بوتل کا کارک کھول کر اس دیو کو باہر نکالئے۔ اب آپ نے اپنے ہاتھوں سے یہ کچھ کیا ہے تو اس کی لکد کوبیاں بھی برداشت کیجئے۔

جب عشق کیا ہے تو صبر بھی کر اس میں تو ہی کچھ ہوتا ہے۔

اس "بھوتوں کے ناچ" کا اثر اگر یہیں تک رہتا تو بھی خیر تھا۔ لیکن اس کی سب سے بڑی زد مغربی پاکستان کی سیاست پر پڑی ہے۔ مغربی پاکستان کی وحدت جن جانگسل مراحل سے گزر کر وجود میں آئی تھی اس کی یاد سے اب بھی "روح کانپ اٹھتی ہے۔ اس وحدت کے بعد اطمینان ہو چلا تھا کہ ملت مزید انتشار سے بچ جائے گی۔ لیکن اب وہاں لیگی اور غیر لیگی کا شاخسانہ چھیڑ کر اس وحدت کو تباہ کرنے کی ٹھان لی گئی ہے۔ ملت سے پارٹیوں کا وجود ختم ہو جانے کا عملی مفہوم یہ ہوتا ہے کہ ذمہ داریوں کے لئے معیار انتخاب اہلیت اور قابلیت قرار پا جاتا ہے اور اس میں پارٹی اور غیر پارٹی کے افراد کا سوال باقی نہیں رہتا۔ ملت کے سب سے زیادہ اہل اور قابل افراد جہاں

بھی ہوں انھیں چن لیا جاتا ہے اور قومی امانتیں ان کے سپرد کر دی جاتی ہیں۔ جب تک وہ اپنی ذمہ داریوں کو دیانت اور قابلیت سے پورا کرتے رہتے ہیں انھیں ان کی کرسیوں پر بحال رکھا جاتا ہے۔ جب وہ اس فریضہ کی ادائیگی میں کوتاہی کرتے ہیں، ان کی جگہ ان سے بہتر افراد کو دیدی جاتی ہے۔ اس کے برعکس پارٹی بازی میں یہ ہوتا ہے کہ پارٹی سے باہر کوئی کتنا ہی قابل کیوں نہ ہو اس پر پارٹی کے مقابلۃً نالائق اور نااہل کو ترجیح دی جاتی ہے۔ اور وہ کچھ ہی کیوں نہ کرے، جب تک وہ پارٹی برسر اقتدار رہتی ہے وہ بھی اپنی کرسی پر مسلط رہتا ہے، بس اس شرط کے ساتھ کہ وہ پارٹی کا وفا شعار رہے۔ عام حالات میں بھی ملت کے اندر انتخاب کا یہ طریق بدترین ہے لیکن جب حالت یہ ہو کہ قوم میں قابل اور دیانت دار افراد کی کمی قریب قریب نقدان کی حد تک پہنچ چکی ہو، اس وقت تو انتخاب کو پارٹی کی چار دیواری سے باہر نہ جانے دینا اپنے ہاتھوں ہلاکت مول لینا ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ پارٹی سسٹم کی حکومت میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ اور چونکہ جمہوری انداز حکومت میں پارٹی سسٹم ناگزیر ہے اس لئے ان نتائج و عواقب سے مفر نہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ مغرب کا جمہوری انداز اور پارٹی سسٹم کیا خدا کا مقرر کردہ ہے جس میں کوئی تبدیلی نہیں کی جا سکتی؟ یہ سسٹم جس انداز سے مغرب میں چل رہا ہے ہم اس کے متعلق اس وقت بحث نہیں کرنا چاہتے۔ ہم کہنا صرف یہ چاہتے ہیں کہ جن حالات سے ہم گذر رہے ہیں۔ ان میں اس انداز حکومت کے نقصانات اس قدر بدیہی ہیں کہ ان سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ جب واقعہ یہ ہو تو پھر اس قدر مضرت رساں طریق حکومت سے محض اس لئے چمٹے رہنا کہ یہ مغربی انداز جمہوریت کی لاینفک شرط ہے، حماقت نہیں تو اور کیا ہے۔

اندریں حالات ہم ارباب لیگ سے ایک مرتبہ پھر وہی گذارش کریں گے جسے ہم نے ۱۹۴۸ء میں پیش کیا تھا۔ اور جسے اس کے بعد ہم اس تکرار و اصرار سے دہراتے رہے ہیں کہ آپ مسلم لیگ کو ختم کیجئے اور ملک کو پارٹی بازی کی لعنت سے نجات دلایئے پوری کی پوری ملت ایک پارٹی ہے۔ اس پارٹی کے اندر اور پارٹیاں مت پیدا کیجئے۔ نئے دستور کے ماتحت ملک میں بغیر پارٹی لیبل کے انتخابات ہوں اور ایوان میں جس جو ہر قابل کو اراکین کی اکثریت کی تائید حاصل ہو اسے وزارت تشکیل کرنے کے لئے کہا جائے اس کے بعد جو مسائل ایوان کے سامنے آئیں۔ ان پر آزادانہ بحث و تمحیص کے بعد آزادانہ فیصلہ لیا جائے۔ اس میں کسی ممبر پر کوئی پابندی عائد نہ کی جائے۔ آپ اپنے ہاں اس کا تجربہ کر کے دیکھئے تو سہی! کیا عجب کہ اس کے خوش آئند نتائج کو دیکھ کر مغربی جمہوریتیں بھی آپ کی تقلید کرنے لگ جائیں۔ آپ نے ہر معاملہ میں مغرب کی امامت کو آنکھیں بند کر کے قبول کر لینے ہی کو اپنا مذہب کیوں بنا رکھا ہے؟ اگر آپ امامتِ امم کے منصب جلیلہ کے سزاوار نہیں بنتے تو کم از کم مغرب کی اندھی تقلید کی غلامانہ ذہنیت سے تو چھٹکارا حاصل کیجئے۔ ہمیں آزادی اس لئے ملی تھی کہ ہم اپنے تصورات کے مطابق اپنا معاشرہ متشکل کریں اگر ہم نے ذہنی طور پر غلام کا غلام ہی رہنا ہے تو جسمانی آزادی سے اس سے زیادہ اور کیا حاصل ہو سکے گا کہ ہمارے ہاں کے چند گھرانے دولت و اقتدار کے مراکز بن جائیں۔ لیکن صحیح آزادی کے ثمرات و برکات اس سے کہیں زیادہ گراں بہا ہوتے ہیں۔

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیٔ داماں بھی ہے

اس لئے ہماری درخواست یہ ہے کہ آپ اس پارٹی سسٹم کو ختم کر کے، پوری کی پوری ملت کو ایک پارٹی سمجھئے اور اس طرح اپنی تنگ دامانی کو حدود فراموش وسعتوں میں بدل دیجئے۔ قرآن کا پیغام اور اقبال کی روح ہم سے بار بار کہہ رہی ہے کہ

تو اے شرمندۂ ساحل اچھل کر بیکراں ہو جا

ایک ضروری اطلاع

محترم پرویز صاحب کی صحت، جو ایک عرصے سے خراب سے خراب تر ہوتی جا رہی تھی، اب اس نقطہ پر پہونچ گئی ہے کہ انہیں مجبوراً کام چھوڑ کر کراچی سے باہر چلے جانا پڑا۔ موجودہ پروگرام کے مطابق وہ جولائی کے شروع میں کراچی واپس تشریف لائیں گے۔ مستفسرین کی خدمت میں گذارش ہے کہ اس دوران میں ان کے نام پر کوئی خط نہ لکھیں۔ استفسارات مدیر طلوع اسلام کے نام بھیجیں۔

معاملہ کی باتیں

(۱) خط و کتابت میں اپنے خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیجئے۔ ورنہ عدم تعمیل کی شکایت معاف۔

(۲) جواب طلب امور کے لئے جوابی کارڈ یا جوابی لفافہ لکھئے۔

(۳) تمام پرچے نہایت احتیاط کے ساتھ ہر مہینہ کی ۳۰ تاریخ کو حوالۂ ڈاک کر دیئے جاتے ہیں۔ اگر کسی وجہ سے آپکا پرچہ آپ تک نہیں پہنچ سکا تو ۱۰ تاریخ تک ادارہ کو مطلع کر دیجئے۔

(۴) آپ کا چندۂ خریداری ختم ہو جانے پر آپ کو اطلاعی کارڈ بھیجا جاتا ہے۔ اگر کسی وجہ سے آپ رسالہ کی سرپرستی آئندہ جاری نہ رکھ سکیں تو ادارہ کو مطلع کر دیجئے۔ ورنہ آپ کو وی۔ پی بھیجا جائے گا جس کا وصول کرنا آپ کا اخلاقی فریضہ ہوگا۔

(۵) رقم کی ترسیل کے سلسلہ میں بہ نسبت وی۔ پی منگانے کے منی آرڈر سے رقم بھیجیے۔ علاوہ کفایت کے یہ محفوظ ترین طریقہ بھی ہے کیونکہ وی پی کے ذریعہ سے جو رقم وصول ہوتی ہے اسمیں عموماً بہت تاخیر ہو جاتی ہے۔ اور ادارہ اس وقت تک رسالہ آپ کے نام جاری نہیں کر سکتا۔ جب تک اس کو وی۔ پی کی رقم ڈاکخانہ سے وصول نہ ہو جائے اسکے برعکس منی آرڈر سے رقم بھیجنے میں آپ غیر ضروری اخراجات اور بلاوجہ زحمت انتظار سے بچ سکتے ہیں

(۶) تبدیلیٔ پتہ یا رسالہ نہ ملنے کی شکایت کے خطوط پر فوراً تعمیل کر دی جاتی ہے البتہ ان خطوط کا جواب دینے کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی۔ لیکن اگر آپ کو اس کی رسید کی اطلاع بھی حاصل کرنی ہو تو جوابی کارڈ بھیجئے۔

دستورِ پاکستان

(اس کی کون کونسی شقیں قرآنی نقطۂ نگاہ سے قابلِ ترمیم ہیں)

مقامِ شکر ہے کہ ۲۳ مارچ ۱۹۵۶ء سے مملکت پاکستان کو اپنا آئین مل گیا۔ اور اس طرح ہم نے ۱۹۳۵ء کے اس دستور سے نجات پائی جو انگریزوں سے آزادی حاصل کر لینے کے بعد بھی ہمارے سر پر بدستور مسلط تھا۔

جیسا کہ ہم پہلے بھی لکھ چکے ہیں۔ انسانوں کا بنایا ہوا کوئی آئین یا قانون بھی اپنے یوم اول سے نہ مکمل ہو سکتا ہے۔ نہ نقائص و استقام سے مبرا۔ تجربہ آہستہ آہستہ اس کی خامیوں کو ابھار کر سامنے لاتا ہے۔ اور اگر نیت بخیر ہو تو مزید غور و خوض سے ان خامیوں کو دور کیا جا سکتا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ موجودہ دستور کو (جیسا کچھ بھی یہ ہے) نہایت تدبر و دیانت سے چلایا جائے۔ اور جہاں جہاں اس کی خامیاں نظر آئیں۔ انہیں آئینی طور پر دور کرنے کی کوشش کی جائے۔

اس دوران میں ہمارے پاس بے شمار استفسارات آئے ہیں جن میں دریافت کیا گیا ہے کہ منظور شدہ دستور کی کون کونسی شقیں قرآنی نقطۂ نگاہ سے قابلِ اصلاح ہیں۔ قارئین طلوع اسلام سے پوشیدہ نہیں کہ جس دن سے تدوین دستور کا کام شروع ہوا، طلوع اسلام اس موضوع پر مسلسل و متواتر لکھتا چلا آیا ہے۔ اس نے شرح و بسط سے بتایا کہ اسلامی دستور کے بنیادی خدوخال کیا ہوتے ہیں۔ اور پاکستان کی موجودہ حالت میں اس کا نفاذ کس طرح ہو سکتا ہے۔ اس نے مجلس آئین ساز کی مختلف کوششوں کو قرآنی میزان میں تولا اور ان کا صحیح صحیح وزن بتایا۔ ہمارا اندازہ یہ ہے کہ اس آٹھ سال کے عرصہ میں طلوع اسلام ہزاروں صفحات اس اہم موضوع پر لکھ چکا ہے۔ اس لئے کہ اس کے نزدیک پاکستان سے مفہوم ہے وہ آئین جس کے مطابق اہل پاکستان کے معاشرہ کی تشکیل ہوتی ہے۔ اس کے باوجود ہمارا خیال تھا کہ منظور شدہ دستور کی مختلف شقوں کا قرآنی نقطۂ نگاہ سے مطالعہ کر کے ایک خود مکتفی جائزہ لے لیا جائے۔ تاکہ ایک طرف ان ہزاروں صفحات میں پھیلی ہوئی تفاصیل سمٹ کر بیک نگاہ سامنے آجائیں۔ اور دوسری طرف یہ معلوم ہو جائے کہ اس میں کون کون سی تبدیلی اسے قرآنی مقصود و منشا سے قریب تر لے آئے گی۔ تاکہ جو حضرات اس میں کسی ترمیم کی کوشش کرنا چاہیں۔ ان کے لئے راستہ آسان ہو جائے۔ ہم چاہتے تھے کہ یہ تبصرہ اس وقت کیا جائے۔ جب نئے انتخابات کے بعد جدید بی مجلس (نیشنل اسمبلی) تشکیل ہو جائے۔ لیکن ایک تو استفسارات کی کثرت نے، اور دوسرے اس حقیقت نے کہ ۲۳ مارچ

کے بعد سابقہ مجلس دستور سازہی نیشنل اسمبلی کی حیثیت اختیار کر جائے گی۔ ہمیں اپنے سابقہ خیال میں تبدیلی پر مجبور کر دیا۔ بنا بریں یہ تبصرہ بلا تاخیر شائع کیا جاتا ہے۔ واضح رہے کہ اس تبصرے میں ہم بڑے اختصار سے کام لیں گے۔ اس لئے کہ وہ تمام امور جن کا اس میں ذکر آئے گا۔ ایسے ہیں جن کے متعلق ہم تفصیلی طور پر پہلے بہت کچھ لکھ چکے ہیں۔ یوں سمجھئے ـــــ کہ یہ تبصرہ ان تفاصیل کا خلاصۂ مبحث (summary) ہے۔

چونکہ طلوعِ اسلام کی نہ کوئی پارٹی ہے۔ اور نہ ہی اس کے پیشِ نظر کوئی سیاسی اغراض و مصالح۔ اس لئے اس میں جو کچھ لکھا جاتا ہے۔ وہ پارٹیوں کی رعایت یا مخالفت سے بلند ہو کر، خالص تحقیقاتی نگاہ سے لکھا جاتا ہے۔ صرف اس پابندی کے ماتحت کہ جو کچھ لکھا جائے وہ ہماری بصیرت کے مطابق قرآنی تعلیم کے مطابق ہو۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔

تمہیداً یہ سمجھ لینا بھی ضروری ہے کہ کسی دستور کے بنیادی نقاط یہ ہوتے ہیں کہ اس میں قانون سازی کے لئے کیا اصول مقرر کئے گئے ہیں۔ اور مملکت کی غرض و غایت اور مقصود و منتہیٰ کیا قرار دی گئی ہے۔ یہی نقاط دستور کی اصل و بنیاد ہوتے ہیں۔ باقی امور ان کی شرح و تفاصیل یا اس مقصد کو بروئے کار لانے کی مشینری کے مختلف اعضاء و جوارح۔ لہٰذا ہمارے اس تبصرہ میں غائر توجہ اسی اصل و بنیاد پر مرکوز رہے گی۔ اور دیگر تفاصیل و جزئیات کو زیادہ اہمیت نہیں دی جائے گی۔

پیشِ لفظ

ہمارے دستور میں سب سے پہلے ایک پیشِ لفظ (Preamble) ہے جو اس کا محور ہے۔ اس پیشِ لفظ کے پہلے فقرہ میں ایک ایسی حقیقت کو بیان کیا گیا ہے۔ جو ہمارے نزدیک اسلامی آئین۔ یا اسلامی نظام اور ہیئت اجتماعیہ کی جان ہے۔ ہم پورے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ اگر ہمارے واضعین دستور اس حقیقتِ کبریٰ کو محض (۱۹۴۹ء کی طرح) تبرکاً زیب عنوان نہ بنا دیتے

بنیادی نقطہ

بلکہ اسے دستور کی اصل و بنیاد قرار دیتے۔ اور ہر مقام پر اس مرکزی نقطہ کو سامنے رکھتے تو اس دستور کے اہم حصے اس شکل سے مختلف ہوتے۔ جس میں یہ اب منظور کیا گیا ہے۔ اور اس وقت اس کے عین اسلامی ہونے میں دو آراء ہو نہ سکتیں۔ وہ حقیقت جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ ان الفاظ میں پنہاں ہے۔ جو پیشِ لفظ کے پہلے فقرہ میں وجہ شادابی قلب و نگاہ بنتے ہیں۔

وہ اختیارات جنہیں باشندگان پاکستان ان حدود کے اندر رہتے ہوئے استعمال کریں گے

جو ان کے لئے ان کے خدا نے متعین کر دی ہیں، ایک مقدس امانت ہیں۔

"ان حدود کے اندر رہتے ہوئے اختیارات کا استعمال جو خدا نے متعین کی ہیں" یہ ہے اسلامی دستور کی اصل بنیاد اور قرآنی معاشرہ کی روح رواں۔ اسلامی نظام پابندی اور آزادی کے حسین امتزاج کا نام ہے۔ پابندی ان حدود limitations

کی جنھیں خطے اپنی کتاب میں متعین فرما دیا ہے۔ اور ان کے اندر رہتے ہوئے اس امر کی کامل آزادی کہ وہ اپنے زمانے کے تقاضوں کے پیشِ نظر اپنے لئے قوانین خود مرتب کریں۔ ان کی حکومت، ان کی ڈیماکریسی، ان کا سیاسی نظم، ان کا معاشرتی نقشہ، ان کا معاشی نظام سب اسی آزادیٔ مشروط کے آئینہ بردار اور اس شجرِ طیبہ کے برگ و بار ہوتے ہیں اگر ان میں سے ایک شق بھی معدوم یا ناقص رہ جائے۔ تو وہ آئین و نظام اسلامی نہیں کہلا سکتا۔ یعنی اگر پابندیوں کی حدود کتاب اللہ سے آگے بڑھ جائیں تو انسانی غلامی ہو جائے گی۔ اور اگر آزادی کی وسعتیں، حدود اللہ سے آگے بڑھ جائیں تو وہ طاغوتی سرکشی قرار پا جائے گی۔

آپ نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ آئین کے پیشِ نظر جو فقرہ اوپر درج کیا گیا ہے وہ کس طرح صحیح اسلامی نظام کا ترجمان ہے۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ یہ فقرہ ہمارے دستور میں فقط زیبِ عنوان بن کر رہ گیا ہے۔ دستور کی مختلف شقوں کا معیار و مدار نہیں بن سکا۔ وہ شقیں اس کے یکسر خلاف جاتی ہیں (جیسا کہ آئندہ چل کر معلوم ہوگا)

مواقع کی یکسانیت

(۲) پیشِ لفظ میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ

افرادِ مملکت کو تمام امور میں یکساں مواقع بہم پہنچائے جائیں گے

(Equality of opportunity

یہ مقصد بہت بلند اور یہ ضمانت بڑی انسانیت نواز ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ عملاً اس سے مقصود کیا ہے؟ مثلاً آپ نے قانون بنا دیا کہ ملک کے بڑے سے بڑے منصب کا دروازہ ہر فردِ مملکت کے لئے کھلا ہوگا۔ بشرطیکہ وہ اس معیارِ تعلیم پر پورا اترے جو اس منصب کے لئے ضروری ہے۔ بہت خوب! پھر آپ نے یہ قانون بھی بنا دیا کہ اسکولوں اور کالجوں میں ہر ایک بچہ تعلیم پا سکے گا کسی پر ان کا دروازہ بند نہیں ہوگا۔ یہ بھی بہت اچھا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ جس غریب کے پاس ان اسکولوں اور کالجوں کے اخراجات کے لئے پیسہ ہی نہیں ہوگا وہ اپنے بچے کو تعلیم کیسے دلا سکے گا۔ اور جب اس بچے کی تعلیم ہی نہیں ہوگی تو مملکت کے مناصب و مدارج کے کھلے ہوئے دروازے اس کے کس کام آ سکیں گے؟ نظری طور پر وہ بے شک سب کے لئے کھلے ہوں گے۔ لیکن عملاً ان میں صرف دولتمندوں کے بچے ہی داخل ہو سکیں گے۔ اس لئے سوال "مواقع کی یکسانیت" کا نہیں بلکہ ذرائع کی یکسانیت کا ہے۔ قرآنی نظام تمام افراد کے رزق (یعنی سامان نشوونما) کے بہم پہنچانے کی ذمہ داری لیتا ہے۔ اور اسی کو صحیح معنوں میں مواقع کی یکسانیت کہا جا سکتا ہے (تفصیل اس اجمال کی آگے چل کر آئے گی)

مقصودِ مملکت

(۳) پیشِ لفظ کے آخر میں لکھا ہے کہ اس دستور کی تدوین سے مقصد یہ ہے کہ پاکستان کے باشندے مرفہ الحال ہوں۔ اس میں شبہ نہیں کہ لوگوں کی مرفہ الحالی نہایت ضروری ہے۔ اور کسی مملکت کا یہ مقصد درخورِ صد تحسین ہے۔ لیکن قرآنی نظام اس سے ایک قدم آگے جاتا ہے۔ وہ مرفہ الحالی کو حصولِ مقصد کا ذریعہ قرار دیتا ہے۔ بجائے خویش مقصد قرار نہیں دیتا۔ اس کے نزدیک مقصد انسانی ذات (Human personality) کی نشوونما اور استحکام ہے۔ مملکت کے وجود کا جواز ہی افراد کی ذات کا نشوونما ہے۔ انسانی ذات کی نشوونما سے مفہوم یہ ہے کہ فرد

کے اندر جس قدر صلاحیتیں رکھی گئی ہیں، مناسب تعلیم و تربیت، سازگار ماحول اور فضا سے ان کی پرورش کی جائے۔ اور ان کی نمود کے پورے پورے مواقع بہم پہنچائے جائیں۔ جس قوم کے افراد کی مضمر صلاحیتیں نشو و نما نہیں پاتیں اور اس طرح انھیں استحکام ذات نصیب نہیں ہوتا۔ اس کی مرفہ الحالی کچھ معنی نہیں رکھتی۔ اس وقت پاکستان کے اوپر کی طبقہ کی مرفہ الحالی میں کسے کلام ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان میں کتنے ہیں جن کی انسانی صلاحیتوں کی نشو و نما بھی ہو چکی ہے یا ہو رہی ہے؟ نشو و نما تو ایک طرف ان میں سے کتنے ہیں جنھیں ان صلاحیتوں کا احساس بھی ہے؟ اس میں شبہ نہیں کہ انسانی ذات کی نشو و نما کے لئے سامان زیست کی فراہمی نہایت ضروری ہے۔ لیکن جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، سامان زیست ان صلاحیتوں کی نشو و نما کا ذریعہ ہے۔ مقصود بالذات نہیں۔ لہٰذا اسلامی مملکت کی غایت، افراد کی ذات کی نشو و نما قرار دینا چاہیئے۔ جس کے لئے ان کا مرفہ الحال ہونا ضروری ہے۔

باب دوم

(بنیادی حقوق)

دستور کا سب سے اہم حصہ یہی باب ہے۔ جس کا تعلق بنیادی حقوق سے ہے۔ بنیادی حقوق سے وہ چیزیں مراد ہیں جنھیں ہر فرد مملکت بطور استحقاق (as of right) مملکت سے طلب کر سکتا ہے۔ اور اگر مملکت ان کے مہیا کرنے میں کوتاہی کرے تو اس کے خلاف عدالت میں دعویٰ دائر کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا دستور کا یہی وہ حصہ ہے جس کا افراد مملکت سے سب سے گہرا تعلق ہے۔

بنیادی ضروریاتِ زندگی

قرآن نہایت واضح الفاظ میں بتاتا ہے کہ جو نظام اپنی نسبت خدائے رب العالمین کی طرف کرتا ہے۔ اس کی کم از کم ذمہ داری یہ ہے کہ وہ تمام افراد مملکت کی بنیادی ضروریات زندگی مہیا کرے۔ لہٰذا ایک اسلامی مملکت میں افراد کا سب سے پہلا بنیادی حق ضروریات زندگی کا مہیا ہونا ہے چونکہ کوئی مملکت اتنے بڑے فریضہ سے عہدہ برا نہیں ہو سکتی۔ جب تک ملک کے وسائل پیداوار اس کی اپنی تحویل میں نہ ہوں۔ اس لئے قرآن کی رو سے وسائل پیداوار افراد کی ذاتی ملکیت کے بجائے ملت کی مشترکہ تحویل میں رہتے ہیں۔ انہی سے وہ مملکت افراد کی ضروریات زندگی بہم پہنچاتی ہے۔ اور انہی سے ان کی صلاحیتوں کی نشو و نما (تعلیم و تربیت وغیرہ) کا انصرام کرتی ہے۔ جو ایک اسلامی مملکت میں افراد کا دوسرا بنیادی حق ہے۔ لیکن ہمارے دستور میں ان میں سے کوئی حق بھی بنیادی حقوق کی فہرست میں شامل نہیں ہے درحقیقت بنیادی حقوق کی یہ فہرست اس چارٹر پر مبنی ہے جسے اقوام متحدہ (یو۔ این) نے مرتب کیا تھا۔ اور جس کی یاد میں ہر سال ایک دن منایا جاتا ہے۔ قرآن کے عطا کردہ بنیادی حقوق یو۔ این۔ او کے چارٹر سے بہت آگے جاتے ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ ہمارا ذہن ابھی ان تنگنائوں سے نکلنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا　　　ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیٔ داماں بھی ہے

عدل

(۲) بنیادی حقوق کی فہرست میں ایک شق (۵) یہ بھی ہے کہ

تمام افراد قانون کی نگاہ میں برابر ہیں۔ اور اس کی حفاظت کے یکساں مستحق۔

یہ شق نہایت عمدہ ہے۔ اور قرآن کے منشا کے مطابق۔ لیکن سوال یہ ہے کہ جس غریب کے پاس عدالت تک پہنچنے کے لئے پیسے ہی نہ ہوں۔ اسے یہ شق کیا فائدہ پہنچا سکے گی؟ موجودہ عدالتی نظم و نسق کی رُو سے انصاف حاصل کرنا درحقیقت انصاف خریدنا ہے۔ جس شخص کے پاس اس کی قیمت نہ ہو۔ وہ اس مارکیٹ تک پہنچ ہی نہیں سکتا۔ کتنے حقدار ہیں جو اپنے حقوق سے اس لئے محروم رہ جاتے ہیں کہ ان کے پاس دادخواہی کے لئے دام نہیں ہوتے! قرآن کی رُو سے مملکت کا بنیادی فریضہ عدل گستری ہے۔ اس لئے افراد کو عدل حاصل کرنے کے لئے کچھ خرچ نہیں کرنا چاہیئے۔ اور یہ چیز ان کے بنیادی حقوق کی فہرست میں داخل ہونی چاہیئے۔

حبس بلا مقدمہ

(۳) شق ۷ (۴) میں یہ کہا گیا ہے کہ حبس امتناعی (Preventive Detention) کی مدت تین ماہ سے زائد نہ ہوگی۔ لیکن اگر مشاورتی بورڈ اس کی سفارش کرے تو یہ مدت بڑھائی بھی جا سکتی ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ مصالح مملکت کے پیش نظر ایسے حالات پیدا ہو سکتے ہیں۔ جن میں کسی کو امتناعی طور پر نظر بند کرنا ضروری سمجھا جائے۔ لیکن اثبات جرم کے بغیر کسی کو قید کرنا یا نظر بند رکھنا قرآنی منشا کے خلاف ہے۔ اس کے لئے عدالت میں مقدمہ چلانا ضروری ہے۔ خواہ بہ تقاضائے مصلحت اس مقدمہ کی کارروائی کو صیغۂ راز میں رکھا جائے۔

اسی طرح زیر تفتیش ملزموں کو پولیس کی حراست میں رکھنا بھی غلط ہے۔ انہیں ایسی جگہ زیر حراست رکھنا چاہیئے جو پولیس کے اثر سے باہر ہو۔ اس قسم کے مقدمات میں پولیس کی حیثیت درحقیقت ایک فریق کی ہو جاتی ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ فریقین میں سے ایک کو دوسرے کی حراست میں دے دینا، انصاف کے تقاضوں کے خلاف ہے۔ عدل و انصاف کے معاملہ میں ایک اسلامی مملکت کو عام انداز سے ہٹ کر خاص روش اختیار کرنی چاہیئے۔ جس میں ہر فرد مملکت کو اطمینان اور یقین ہو کہ اس پر کسی قسم کی زیادتی نہیں ہو سکتی۔ حقیقت یہ ہے کہ آزادی اور غلامی کی پرکھ کا دلین میدان عدالت کا احاطہ ہوتا ہے۔ اگر وہاں خالصتہً قانون کی حکمرانی ہے۔ تو یہ صحیح معنوں میں آزادی ہے۔ لیکن اگر وہاں قانون پر (دانستہ یا نادانستہ) دیگر امیال و عواطف اثر انداز ہوتے ہیں۔ تو یہ غلامی ہے۔

علاقائی تناسب

(۴) شق ۱۷ (۳) میں یہ کہا گیا ہے کہ پندرہ برس تک مملکت کی کچھ اسامیاں (POSTS) بعض علاقوں کے لئے مخصوص رکھی جائیں گی۔ تاکہ ملازمتوں میں ان علاقوں کی نمائندگی پوری ہو جائے۔

یہ شق قرآنی منشاء کے خلاف ہے۔ قرآن جنت میں داخلہ کے لئے صلاحیت کو لابنفک شرط قرار دیتا ہے۔ اور اس میں کسی قسم کی رعایت کی گنجائش نہیں رکھتا۔ اس سوال پر ذرا جذبات سے ہٹ کر غور کیجئے۔ اگر ایک قابل باپ اپنے نالائق بیٹے کو کسی

آسامی پر تعینات کر دیتا ہے۔ تو ہم میں سے ہر شخص اس کی مذمت کرتا ہے۔ ہم ایسا کیوں کرتے ہیں؟ اس لئے کہ اس شخص نے صلاحیت کی بجائے کسی اور شے کو معیارِ انتخاب بنا دیا ہے۔ لیکن اگر بعینہٖ یہی کچھ کسی خاص علاقہ کے لوگوں کے سلسلہ میں کیا جائے۔ تو اسے قابل اعتراض نہیں سمجھا جاتا۔ حالانکہ مملکت کو جو نقصان اس نالائق بیٹے کے انتخاب سے پہنچا ہے۔ وہی نقصان اس علاقہ کے نالائق افراد کے انتخاب سے پہونچے گا۔

اس میں شبہ نہیں کہ قرآن عدل کے ساتھ احسان کی بھی تعلیم دیتا ہے۔ لیکن احسان کے معنی ہیں کسی کی کمی (Deficiency) کو پورا کر کے اس کے توازن و تناسب کو بحال کر دینا۔ اگر کوئی علاقہ پس ماندہ ہے۔ تو اس سے احسان کے معنی یہ ہوں گے کہ اس علاقہ میں دوسرے علاقوں کے مقابلہ میں تعلیم و تربیت کے خاص انتظامات کئے جائیں۔ اور اس طرح ان لوگوں کو دوسرے لوگوں کی سطح پر لایا جائے۔ نہ یہ کہ وہاں کے نااہل لوگوں کو حکومت کی مشینری کے پرزے بنا کر اسے ایسا کمزور کر دیا جائے کہ ساری مملکت کا توازن ہی بگڑ جائے۔

(۵) مذہبی فرقے شق ۱۸(ب) میں مذہبی فرقوں کے حقوق کا ذکر ہے۔ جہاں تک مسلمانوں کے مذہبی فرقوں کا تعلق ہے اس کے متعلق شق ۱۹۸(۴) کے ضمن میں گفتگو کی جائے گی۔

(۶) حقوق اور فرائض اس باب کے خاتمہ پر ایک اصولی نقطہ کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے۔ اس میں جس قدر حقوق کا ذکر ہے۔ ان میں سے ہر ایک اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ وہ مصالح عامہ، ضوابط اخلاق یا قوانین مملکت سے متصادم نہ ہوں۔ مثلاً ہر شخص کو اظہار خیالات کی آزادی ہوگی۔ بشرطیکہ وہ ان پابندیوں کو نہ توڑیں۔ جو اس باب میں عائد کی جائیں۔ یا مثلاً کسی شخص کی جان نہیں لی جائے گی۔ بشرطیکہ قانون کا ایسا تقاضا ہو۔ یہ ٹھیک ہے کہ حقوق مشروط ہوتے ہیں۔ لیکن اسلامی آئین میں ان سب کے لئے ایک ہی شرط کافی ہوتی ہے۔ اور وہ یہ کہ "بشرطیکہ ان کا استعمال حدود اللہ کے اندر رہتے ہوئے کیا جائے"۔ یہ وہ بنیادی شرط ہے جو آئین پاکستان کے پیش لفظ کے پہلے فقرہ میں موجود ہے (اور جس کا ذکر پہلے آچکا ہے) حقیقت یہ ہے کہ اگر ہم قرآن سے مشورہ کریں۔ تو وہ ہمیں حقوق انسانیت اور ان سے متعلق حدود کا ایک ایسا جامع تصور دیتا ہے۔ جس کے بعد ہمیں کہیں اور سے کچھ مستعار لینے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ نیز قرآن جہاں حقوق کی فہرست دیتا ہے اس کے ساتھ ہی فرائض کی تفصیل بھی بیان کر دیتا ہے۔ افراد مملکت کے صرف حقوق ہی نہیں ہوتے۔ فرائض بھی ہوتے ہیں اور حقوق درحقیقت ان فرائض کی سرانجام دہی کا صلہ ہوتے ہیں۔ البتہ دو حقوق ایسے ہیں۔ جو بلا مشروط ہیں۔ یعنی افراد مملکت کی ضروریات زندگی (رزق) کی بہم رسانی اور عدل گستری۔ ان سے کسی فرد کو کسی حالت میں بھی محروم نہیں کیا جا سکتا نہ ان پر کسی قسم کی شرط عائد کی جا سکتی ہے۔ مملکت کا ہر فرد اپنی ضروریات زندگی اور انصاف حاصل کرنے کا ہر حال میں مستحق ہے۔

باب سوم

(مملکت کے اصولِ ہدایت)

اصولِ ہدایت کی آئینی یا قانونی پوزیشن کچھ نہیں ہوتی۔ محض واعظانہ حیثیت ہوتی ہے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ جو اہم باتیں دستور کے اندر ہونی چاہیئے تھیں۔ وہ اصولِ ہدایت کے اندر شامل کردی گئی ہیں۔ اس سے بنظرِ غائر آئین بڑا خوش آئند بن گیا ہے۔ لیکن عملاً اس کا نتیجہ وہ مرتب نہیں ہوگا۔ جو ایسے آئین کا ہونا چاہیئے۔ مثلاً اس باب میں یہ کہا گیا ہے کہ مملکت اس امر کی کوشش کرے گی کہ

(۱) ملک سے ناخواندگی کو دور کرے۔

(۲) افرادِ مملکت کی تعلیم و تربیت کا انتظام کرے۔

(۳) ملک کو مرفہ الحال بنائے۔ اور دولت اور وسائل پیداوار کو چند افراد میں مرکوز نہ ہونے دے۔

(۴) افرادِ مملکت کی بنیادی ضروریاتِ زندگی مہیا کرے۔ وغیرہ وغیرہ

ظاہر ہے کہ یہ چیزیں اسلامی مملکت کے بنیادی فرائض میں داخل ہیں۔ اور ان کا مہیا کرنا مملکت کی اولین ذمہ داری۔ لہٰذا ان کا صحیح مقام۔ خود آئین کا متن ہے نہ کہ اصولِ ہدایت، جن کی آئینی حیثیت کچھ نہیں۔ یہ ہمارے زیرِ نظر آئین کا بنیادی سقم ہے۔ اور جب تک یہ سقم دور نہیں ہوتا۔ اسے اسلامی نہیں کیا جاسکتا۔ اور تو اور جہاں تک مسلمانوں کی زندگی کو قرآن و سنت کے مطابق بنانے کا سوال ہے۔ اس کے لئے بھی اتنا ہی کہا گیا ہے کہ مملکت اس کے لئے کوشش کرے گی۔ حالانکہ پاکستان کے حصول، قیام اور بقا کا بنیادی مقصد ہی یہ تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ یہ ذمہ داریاں ایسی ہیں جنھیں ایک نوزائیدہ مملکت ایک دن میں پورا نہیں کرسکتی۔ یہ بتدریج پوری ہوں گی۔ لیکن آئین میں یہ بھی تو کہا جاسکتا ہے کہ مملکت کا نصب العین یہ ہے۔ جس تک پہونچنے کے لئے بتدریج قدم اٹھائے جائیں گے۔

(۲) فواحش کا سدِّ باب

اس باب میں یہ بھی لکھا ہے کہ مملکت کوشش کرے گی کہ

(۱) عصمت فروشی، قمار بازی۔ شراب اور دیگر مسکرات کے استعمال کو روکا جائے اور

(۲) ربوٰا کو جلد از جلد ختم کیا جائے۔

یہ وہ فواحش اور نواہی ہیں۔ جن سے قرآن نے حتماً روکا ہے۔ اس لئے انھیں ختم کرنا، اسلامی مملکت کا اولین فریضہ ہے بنا بریں ان کا صحیح مقام بھی آئین کا متن ہونا چاہیئے۔ نہ کہ اصولِ ہدایت کے مواعظِ حسنہ۔ نیز یہ بھی سمجھ میں نہیں آیا کہ ان دو چار نواہی کے خصوصی ذکر کی کیا ضرورت تھی۔ جب آئین میں یہ شق موجود ہے کہ پاکستان میں کوئی قانون کتاب و سنت کے خلاف نافذ نہیں ہوگا۔ اور موجودہ قوانین کو کتاب و سنت کے مطابق کیا جائے گا۔ تو مذکورہ صدر امور کا خصوصی ذکر محض تکلف ہے۔

کیا "کتاب و سنت" والی شق ان امور کو خود بخود محیط نہیں ہو جائے گی؟۔

(۳) زکوٰۃ

دفعہ ۲۵(۲) میں درج ہے کہ مملکت زکوٰۃ، اوقاف اور مساجد کی تنظیم کا مناسب انتظام کرے گی۔

جہاں تک زکوٰۃ کا تعلق ہے۔ یہ شق ایک بنیادی غلط فہمی پر مبنی ہے۔ عام طور پر کہا یہ جاتا ہے کہ اسلامی مملکت جو ٹیکس وصول کرتی ہے۔ زکوٰۃ اس سے کوئی الگ شے ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ نہیں۔ اسلامی مملکت کے عاید کردہ ٹیکس ہی کو زکوٰۃ کہتے ہیں (بلکہ صحیح تر الفاظ میں اسلامی مملکت کے تمام محاصل کا اصطلاحی نام زکوٰۃ ہے۔ کیونکہ ان سے مقصود اور غایت نوع انسانی کی نشوونما ہے۔ اور یہی اس لفظ کے بنیادی معنی ہیں) حکومت کے ٹیکس اور زکوٰۃ کے الگ الگ ہونے کا تصور اس وقت پیدا ہوا۔ جب ہمارے ہاں (بدقسمتی سے) عیسائیت کی طرح سیاست کو مذہب سے الگ کر لیا۔ اس وقت "خدا کا حصہ خدا کے لئے اور قیصر کا حصہ قیصر کے لئے" مقرر ہوا۔ ہم میں سے آج ہر شخص منبر اور اسٹیج سے پکارتا رہتا ہے کہ ہمارے ہاں مذہب اور سیاست میں کوئی فرق نہیں۔ لیکن اس دعوے کے باوجود ہماری عملی حالت یہ ہے کہ ہم زکوٰۃ کو خدا کا ٹیکس تصور کرتے رہتے ہیں۔ اور جو کچھ اسلامی حکومت وصول کرتی ہے اسے مملکت کا ٹیکس سمجھتے ہیں۔ اور اس ثبوت میں "منبر اور اسٹیج" دونوں شامل ہیں۔ چنانچہ ہمارا زیر نظر دستور، اہل سیاست نے پاس کیا ہے۔ اور ارباب مذہب نے اس کے اسلامی ہونے کی سند عطا کی ہے اور دونوں میں سے کسی نے اس پر غور نہیں کیا کہ مذہب اور حکومت کی یہ تفریق یکسر غیر اسلامی ہے۔

اوقاف

اسی طرح قرآن کی رو سے اوقاف کی بھی دینی حیثیت کچھ نہیں۔ قرآن ایک مردہ کو یہ حق نہیں دیتا کہ وہ ابدالآباد تک زندوں پر اپنی مرضی چلائے۔ اوقاف کے موجودہ املاک بلاشرط مملکت کی تحویل میں چلے جانے چاہئیں اور آئندہ کے لئے وقف کا غیر قرآنی تصور ختم کر دینا چاہیئے۔

مساجد

باقی رہی مساجد، سو ان کی حیثیت محض پرستش گاہوں کی نہیں۔ وہ ملت اسلامیہ کے تنظیمی مراکز بھی ہیں۔ اس لئے انہیں ملت کے تنظیمی پروگرام میں یہی حیثیت دینی چاہیئے۔

باب چہارم

(وفاقی حکومت)

غیر مسلموں کی پوزیشن

شق ۵۲(۱) میں یہ درج ہے کہ مجلس مقننہ کا رکن ہر فرد مملکت ہو سکتا ہے۔ یہاں یہ اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلامی مملکت کی مجلس مقننہ میں غیر مسلموں کو شامل کیا جا سکتا ہے یا نہیں۔ اس سوال کا جواب بڑا آسان ہے۔ اسلامی مملکت میں مجلس مقننہ کا فریضہ یہ ہوتا ہے (اور اس کی صراحت خود ہمارے دستور میں موجود ہے) کہ وہ حدود اللہ کے اندر رہتے ہوئے (یا ہمارے دستور کے الفاظ میں قرآن و سنت کے مطابق) قوانین مرتب کرے

اب ظاہر ہے کہ ایک غیر مسلم ملت اسلامیہ کے لئے حدود اللہ (یا کتاب وسنت) کی روشنی میں کس طرح قانون مرتب کر سکتا یا ایسے قوانین کی تدوین میں شریک ہو سکتا ہے؟ یہی وجہ ہے کہ قرآن انھیں شریک مملکت نہیں کرتا۔ بلکہ اس اعتبار سے کہ وہ اسلامی منہاج وسلک کی صداقت کے معترف نہیں ہوتے، انھیں شریک راز کرنے کی بھی اجازت نہیں دیتا۔ لہٰذا ایک غیر مسلم اسلامی مملکت کی مجالس مقننہ اور اجرائیہ کا رکن کبھی نہیں ہو سکتا۔ نہ ہی مملکت کے غیر مسلم باشندے ان مجالس کے انتخاب میں حصہ لے سکتے ہیں۔ بعض (بلکہ آجکل تو اکثر) طبائع کو یہ چیز بڑی ناگوار گذرے گی۔ اور وہ اسے انتہائی تنگ نظری پر محمول کریں گے۔ اور اسے اصول جمہوریت کے خلاف قرار دیں گے۔ سو پہلی چیز تو یہ ہے کہ دین کے معاملہ میں ہماری ناگواری یا خوش آئندی کا کوئی سوال ہی نہیں دین کے اصول اٹل ہیں۔ اور وہ کسی کی ناگواری کی بنا پر بدلے نہیں جا سکتے۔ لہٰذا اس سوال کو اس پہلو سے دیکھنا چاہیئے کہ کیا قرآن کا اس باب میں یہی فیصلہ ہے۔ اگر اس کا یہی فیصلہ ہے تو مسلمان کا شیوہ اس فیصلہ کے سامنے سر جھکا دینا ہوگا۔ خواہ اس کے ذاتی رجحانات واحساسات کچھ ہی کیوں نہ ہوں۔ قرآن کا فیصلہ اس باب میں بالکل واضح ہے۔ اور اس میں دو آراء کی گنجائش ہی نہیں۔ لہٰذا بات بالکل صاف ہے۔ لیکن اس کے باوجود، مقام صد حیرت ہے کہ قرآن کے ایسے کھلے ہوئے فیصلہ کی موجودگی میں یہ آئین ان لوگوں نے پاس کر دیا ہے۔ جو اپنی مجلس کا آغاز بھی قرآنی آیات سے کرتے تھے۔ اور جنھوں نے آخر میں خیر وبرکت کی دعائیں بھی قرآنی آیات ہی کے الفاظ میں مانگی تھیں۔ اور اس سے بھی زیادہ تعجب انگیز یہ کہ ملک کے ارباب مذہب میں سے کسی نے بھی اس کے خلاف ایک لفظ نہیں کہا۔ حالانکہ ان میں سے اکثر اس سے پیشتر اپنی تحریروں اور تقریروں میں اسے اسلام کے خلاف قرار دیا کرتے تھے۔

باقی رہا تنگ نظری کا طعن۔ سو مغرب کی فراخ نگہی کے معیار کے مطابق تو اس زمانے میں کسی مملکت کا مذہب کی بنیادوں پر قائم ہونے کا دعوے ہی ہزار تنگ نظری کی ایک تنگ نظری ہے۔ لہٰذا اگر تنگ نظری کے طعن سے بچنا ہے تو پھر مملکت کے معاملہ میں اسلام کا نام لینا بند کر دو۔ جس طرح دنیا کی "کشادہ نظر" قومیں اپنے سیاسی معاملات کا حل سوچتی ہیں۔ اسی طرح آپ بھی کریں۔ پھر یہ "خدا اور رسول" کیسا۔ اور "کتاب وسنت" کیا؟

تیسری بات ہے آئین جمہوریت کی۔ سو جیسا کہ ہم شروع میں لکھ چکے ہیں۔ اسلام میں جمہوریت کا تصور بھی زندگی کے دیگر شعبوں کی طرح حدود اللہ کی پابندی سے مشروط ہے۔ ہمارے ہاں کوئی جمہوریت قابل قبول نہیں ہو سکتی۔ اگر وہ حدود اللہ سے ٹکراتی ہے۔ لہٰذا اسلامی مملکت کی مجالس مقننہ کی ترتیب وتشکیل کا جو تصور اوپر بیان کیا گیا ہے۔ وہ اسلامی جمہوریت کے عین مطابق ہے۔ اگر وہ مغربی جمہوریت کے خلاف ہے تو ہوا کرے۔ ہم نے پاکستان اسلامی جمہوریت کے قیام کے لئے حاصل کیا ہے۔ نہ کہ مغربی جمہوریت کے لئے۔ اگر ہمارے نزدیک مغربی جمہوریت ہی قابل قبول ہوتی۔ تو ہمیں ہندوستان سے کٹ کر الگ مملکت بنانے کی ضرورت ہی کیا تھی؟

کس قدر مقام تاسف ہے کہ آج ہمارے ذمہ دار حضرات میں کوئی شخص ایسا نہیں (نہ لیڈروں میں نہ مولویوں میں) جو مصلحت

گوشیوں سے بے نیاز ہو کر دنیا کو بیباکانہ بتائے کہ اسلامی ہیئت اجتماعیہ کا تصور کیا ہے اور اس میں غیر مسلموں کی پوزیشن کیا؟

(۲) ارکانِ اسمبلی کے حقوق — شق ۵۶(۳) میں لکھا ہے کہ نیشنل اسمبلی کا ممبر اسمبلی میں جو کچھ بھی کہے گا۔ اس پر اس کی تقریر کے سلسلہ میں کوئی مقدمہ نہیں چلایا جائے گا۔ اس میں شبہ نہیں کہ ارکان اسمبلی کو اظہار خیال کی آزادی ہونی چاہیئے۔ لیکن نہ ایسی آزادی کہ انہیں قانون کی حد سے بالا سمجھا جائے۔ اگر کوئی شخص عام مجمع میں ایسی بات کہے جو قانون کی گرفت میں آتی ہو تو سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر وہی بات اسمبلی کے اجتماع میں کہے۔ تو اس پر قانونی مواخذہ کیوں نہ ہو! ہمیں تو قرآن سے اس قسم کا کوئی اشارہ نہیں ملتا۔ جس کی رو سے کوئی ایسا مقام بھی ہو سکتا ہے۔ جہاں جرم کا ارتکاب جرم نہ سمجھا جائے لیکن اگر کسی مصلحت سے ارکان اسمبلی کو اس قسم کی آزادی دینی ضروری ہو۔ تو ہمارا مشورہ یہ ہے کہ اسمبلی کی کارروائی کو اخبارات میں شائع نہ کیا جایا کرے۔ تاکہ قابل اعتراض باتوں کی عام اشاعت نہ ہو۔ اگر کوئی ممبر اسمبلی میں مملکت کے خلاف بغاوت انگیز تقریر کرے۔ تو اسے اسمبلی کی چار دیواری تک محدود رکھا جائے۔ اسے ملک میں تو نہ پھیلایا جائے۔

نواں باب

(عدالت)

عدالت کے جج — نہ عدالت عالیہ کے چیف جسٹس کے لئے اور نہ ہی دوسرے ججوں کے لئے مسلمان ہونے کی شرط رکھی گئی ہے آپ سوچئے کہ جس مملکت کا قانون کتاب و سنت پر مبنی ہو۔ اور اسی قانون کے مطابق مقدمات کے فیصلے ہونے ہوں۔ اس میں غیر مسلم جج ایسے فیصلے کس طرح کر سکیں گے؟ جج کے لئے قانون کے الفاظ ہی دلیل راہ نہیں بنتے۔ اس کے لئے قانون کی روح سے واقفیت۔ اس معاشرہ کے مزاج کا صحیح صحیح ادراک جس میں وہ قانون نافذ ہو۔ اور اس ملت کے ضمیر کا گہرا احساس، جس سے اس قانون کے تقاضے ابھرتے ہیں بھی ضروری ہے۔ اور یہ ایک غیر مسلم کے لئے ناممکن ہے۔

(۲) قانون کی تعبیر — شق ۱۵۶(۱) میں مذکور ہے کہ اگر مرکزی اور صوبائی حکومت میں آئین کی تعبیر کے بارے میں اختلاف ہو۔ تو اس کا فیصلہ عدالت عالیہ کرے گی۔ لیکن اگر کسی فرد کے حقوق کے متعلق آئین کی تعبیر کا سوال درپیش ہو۔ تو اس کے متعلق کچھ نہیں کہا گیا کہ اس کا فیصلہ کون کرے گا۔ ظاہر ہے کہ افراد کو بھی یہ حق ہونا چاہیئے کہ وہ اختلافی معاملات میں عدالت عالیہ کا دروازہ کھٹکھٹا سکیں۔ افراد کو اس حق سے کیوں محروم رکھا جائے؟

دسواں باب

(ملازمتیں)

مملکت کی اسامیاں شق ۱۷۹ میں جو کچھ کہا گیا ہے۔ اس کا عملاً مفہوم یہ ہے کہ پاکستان کا ہر شہری ہر اسامی کے لئے منتخب ہو سکتا ہے۔ اس کی تائید باب دوم شق ۱۷(۱) سے بھی ہوتی ہے۔ جو بنیادی حقوق سے متعلق ہے۔

جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں، اسلامی مملکت میں غیر مسلموں کو شریک راز نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے ایسی کلیدی اسامیاں جن کا تعلق رازہائے مملکت سے ہو۔ غیر مسلموں کے لئے کھلی نہیں رکھی جا سکتیں۔

(۲) ملازمین کی اپیل رائج الوقت قوانین کی رو سے ملازمین کے تنازعہ فیہ امور کا فیصلہ یا تو ان کا دفتر کر دیتا ہے یا زیادہ سے زیادہ پبلک سروس کمیشن سے مشورہ لے لیا جاتا ہے حتیٰ کہ سزا کی صورت میں ان کی اپیل بھی کسی ثالث تک نہیں پہنچتی۔ یہ صورتِ حالات بڑی غیر تسلی بخش ہے۔ جس میں ملازمین قاطبۃً اپنے دفتر کے رحم و کرم پر رہتے ہیں۔ زیر نظر آئین میں بھی اس صورتِ حالات میں ترمیم و اصلاح کی کوئی گنجائش نہیں رکھی گئی۔ یہ چیز عدالت گستری اور دادخواہی کے بنیادی اصولوں کے خلاف ہے۔ جب کسی ملازم اور اس کے دفتر میں تنازعہ ہو تو اس کا فیصلہ اس کے دفتر کو نہیں بلکہ کسی ثالث کو کرنا چاہیئے۔ جس کے نزدیک فریقین کی حیثیت مساوی ہو۔ یا کم از کم اسے کسی ثالث کے پاس مرافعہ (اپیل) کا حق ہی حاصل ہو۔

بارھواں باب

(اسلامیات)

کتاب و سنت ہم جیسا کہ شروع میں لکھ چکے ہیں کسی مملکت کے آئین کے دو پہلو سب سے زیادہ اہم اور بنیادی ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ اس میں قانون سازی کے اصول کیا متعین کئے گئے ہیں۔ اور دوسرا یہ کہ اس میں مملکت کی غرض و غایت کیا قرار دی گئی ہے۔ زیر نظر باب کا تعلق قانون سازی کے اصولوں سے ہے۔ اس لئے یہ بڑا اہم ہے۔

ہماری بدقسمتی ہے (اور اسی چیز نے مسلمانوں کو اقوام عالم میں اس قدر پس ماندہ بنا رکھا ہے) کہ ہم زندگی کے اہم مسائل تک کا فہم و بصیرت اور تدبر و تفکر سے مطالعہ نہیں کرتے۔ بلکہ انھیں ہمیشہ سطحی جذبات کے تابع رکھتے ہیں۔ قوم کا گروہ عظیم جاہل اور اس لئے اندھی تقلید کا خوگر ہے۔ ان کی مہار مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں ہے۔ جن کا مفاد اسی میں ہے کہ قوم کو جاہل رکھا جائے۔ اس لئے جس گوشے سے فہم و بصیرت اور عقل و فکر کی آواز اٹھے۔ وہ اسے دبانے کے لئے بصد جوش و خروش اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ اور (دیگر معاملات میں ان کے باہمی اختلافات کتنے ہی کیوں نہ ہوں) اس مخالفت میں وہ سب متحد و متفق ہو جاتے ہیں۔

آپ اپنی تاریخ پر غور کیجئے۔ ہر زماں اور ہر مقام میں اسی حقیقت کا اعادہ نظر آئے گا۔ اب ظاہر ہے کہ جس قوم کو صدیوں تک سوچنے اور غور کرنے سے باز رکھا جائے۔ اس میں غور و فکر کی صلاحیت ہی ختم ہو جاتی ہے۔ یہی حالت ہماری ہو چکی ہے۔

ہماری تاریخ میں یہ پہلا موقعہ تھا کہ ایک مملکت اسلام کی بنیادوں پر اپنا آئین مرتب کرنے کے لئے اٹھی تھی۔ یہ موقعہ بڑا مبارک اور یہ فال بڑی نیک تھی۔ طلوع اسلام نے پہلے دن سے تحریک پاکستان کا ساتھ ہی اس لئے دیا تھا کہ اس سے ہمیں ایک ایسی مملکت مل جائے گی۔ جس میں ہم صحیح اسلامی بنیادوں پر آئین مرتب کر کے اس قرآنی معاشرہ کو پھر سے قائم کر سکیں گے۔ جو ہمارے قرنِ اول میں بایں ہمہ زیبائی و رعنائی قائم ہوا تھا۔ اور جسے دوبارہ دیکھنے کے لئے آسمان آج تک چکر کاٹ رہا ہے۔ اس مقصد کے لئے طلوع اسلام نے اپنی قرآنی بصیرت کے مطابق بتایا کہ ایک اسلامی مملکت کا مقصود و مطلوب کیا ہوتا ہے۔ اور اس میں قانون سازی کے اصول کیا ہوتے ہیں۔ اول الذکر شق کے متعلق اس نے بتایا کہ قرآن کی رو سے اسلامی نظام کی غرض و غایت یہ ہے کہ وہ تمام افراد مملکت کی ضروریات زندگی کے بہم پہنچانے کی کفیل ہو۔ اور ان کی مضمر صلاحیتوں کی نشو و نما سے ان کی ذات کے ارتقاء اور استحکام کی ذمہ دار بنے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے ضروری ہے کہ ملک کے وسائل پیداوار افراد کی ملکیت کے بجائے ملت کی مشترکہ تحویل میں رہیں تاکہ خدا کی صفت رب العالمینی مشہود و محسوس انداز میں سامنے آجائے۔ قرآن سے یہ چیز بالکل واضح ہے۔

دوسری شق کے متعلق اس نے بتایا کہ اسلام ثبات اور تغیر (Permanence and Change) کے امتزاج کا نام ہے اس نے زندگی کے وہ بنیادی اصول و اقدار عطا کر دیئے ہیں۔ جو زمان و مکان کی حدود سے ماورا اور تغیراتِ زمانہ سے ناآشنا ہیں۔ وہ اپنی جگہ پر محکم اور اٹل رہتے ہیں۔ اور خارجی تبدیلیوں سے اثر پذیر نہیں ہوتے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے یہ بتایا کہ زمانے کے تقاضے اور انسانی ضروریات بدلتی رہتی ہیں۔ اس لئے معاشرے کا جو پیکر کسی ایک دور میں موزوں و مناسب ہوتا ہے وہ دوسرے دور میں غیر موزوں ہو جاتا ہے۔ زندگی کے اس حصے کا تعلق تغیرات سے ہے۔ اسلامی نظام سے مقصود یہ ہے کہ ہر دور کے مسلمان خدا کے متعین کردہ غیر متبدل اصولوں کے اندر رہتے ہوئے اپنے اپنے زمانے کی ضروریات کے مطابق اپنے لئے قوانین خود مرتب کریں۔ اور اس طرح ثبات و تغیر کے امتزاج سے زندگی کے راستوں میں آگے بڑھتے اور بلند ہوتے چلے جائیں۔ واضح رہے کہ "اپنے زمانے میں خود قوانین مرتب کرنے" سے مراد یہ نہیں کہ ہر نئی حکومت سابقہ حکومتوں کے تمام فیصلوں کو منسوخ کر کے از سر نو قانون سازی شروع کر دے۔ دنیا کی کوئی حکومت بھی ایسا نہیں کر سکتی۔ مطلب اس سے یہ ہے کہ کسی دور کی حکومت جہاں یہ دیکھے کہ کسی سابقہ فیصلہ میں تبدیلی کی ضرورت ہے وہ اس میں تبدیلی کر دے۔ باقی قوانین علیٰ حالہٖ جاری رہیں۔ اس نظام حیات یا ضابطۂ زندگی کا نام ہے دین الاسلام۔ اس کے برعکس، ایک نظامِ زندگی وہ ہے۔ جس میں یہ بتایا جاتا ہے کہ دنیا میں نہ کوئی مستقل قدر ہے۔ نہ غیر متبدل اصول۔ انسان اپنی مصلحتوں کے مطابق جو انداز زندگی چاہے اختیار کرے۔ اسے مادیت (Materialism) کہا جاتا ہے جس پر مغربی تہذیب کی عمارت استوار ہے۔ دوسرا نظام وہ ہے جس میں یہ کہا جاتا ہے کہ معاشرہ کی جو جزئیات ایک دفعہ متعین ہو گئیں۔ ان میں کبھی تبدیلی نہیں کی جا سکتی۔ جو کچھ اسلاف سے ہوتا چلا آرہا ہے۔ اخلاف کو وہی کچھ کرتے رہنا چاہیئے۔ اس

میں کسی قسم کا تغیر و تبدل گناہ ہے۔ اسے عام مفہوم کے مطابق مذہب، یا دھرم یا (Religion) کہتے ہیں، اور پیشوائیت (Priestcraft) اس کی محافظ اور علمبردار ہوتی ہے۔ ان تصریحات سے واضح ہے کہ اسلام نہ مغربی اندازِ فکر کے مطابق مادیت ہے۔ اور نہ ہی مشرقی اسلوب زندگی کے مطابق دھرم یا مذہب۔ وہ دونوں کے خلاف دین ہے۔ جس میں ثبات و تغیر دونوں کا امتزاج ہوتا ہے۔

قرآن نے ربوبیت عامہ کو معاشرے کی ذمہ داری قرار دے کر سرمایہ داری کے تصور کو ختم کر دیا۔ اور دھرم کو دین سے بدل کر پیشوائیت کے ادارے (Institution) کو مٹا دیا۔ لیکن جب مسلمانوں کی نگاہوں سے قرآن اوجھل ہوا تو ان دونوں انسانیت کش سانپوں نے اپنے اپنے بلوں سے پھر سر نکالا۔ اس مقام پر ایک اور حقیقت کا سمجھ لینا بھی ضروری ہے۔ سرمایہ داری صرف استبداد کے زور پر قائم رہ سکتی ہے۔ اس کے پاس دولت اور اس کی بنا پر حاصل کردہ قوت کے سوا کوئی دلیل نہیں ہوتی۔ اگر غریبوں اور کمزوروں کے سر سے قوت کے ڈنڈے کو ہٹا کر انھیں تھوڑے سے وقت کے لئے بھی آزادانہ سوچنے کا موقعہ دیدیا جائے تو وہ فوراً اس نتیجہ پر پہنچ جاتے ہیں کہ سرمایہ داری ظلم و استبداد کے سوا اور کچھ نہیں۔ لہٰذا سرمایہ داری کی مسلسل کوشش یہ رہی ہے کہ عوام کو آزادانہ سوچنے کا موقعہ ہی نہ دیا جائے۔ اس کے لئے اس کے پاس قوت کا ڈنڈا ہوتا ہے۔ لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ قوت خواہ کتنی ہی جابر اور قاہر کیوں نہ ہو زیادہ دیر تک برقرار نہیں رکھی جا سکتی۔ قوت کو برقرار رکھنے کے لئے ایک مسلسل تناؤ (Tension) کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو بجائے خود بیش مستقل عذاب ہوتا ہے۔ اس لئے سرمایہ داری کو اس مقصد کے حصول کے لئے کسی اور آسرے کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ آسرا پیشوائیت بہم پہنچاتی ہے۔ وہ عوام سے کہتی یہ ہے کہ

(۱) امیر اور غریب کی تفریق خدا کی طرف سے ہے جس نے مختلف افراد کی تقدیر (قسمت) متعین کی ہے اسی کے مطابق رزق کی تقسیم ہوتی ہے۔

(۲) دولت اور جائداد کی ذاتی ملکیت پر کسی قسم کی پابندی عائد نہیں کی جا سکتی۔ نہ ہی غریبوں کو دولتمندوں پر رشک کرنا چاہیئے۔ کیونکہ اللہ کے مقرب غریب ہی ہوتے ہیں۔

(۳) یہ تمام امور مذہب سے متعلق ہیں۔ اور مذہب انسانی عقل و فکر سے ماوراء ہوتا ہے۔ اس لئے اس میں سوچ بچار کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ ہمیں جو کچھ اسلاف سے ملے اس پر آنکھیں بند کر کے چلتے رہنا چاہیئے۔

پیشوائیت اس طرح عوام کو ان کی حالت پر مطمئن رکھ کر ان سے سوچنے کی صلاحیت سلب کر لیتی ہے۔ اس طرح قوت کے استعمال کے بغیر اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ آپ تاریخ کے صفحات کو الٹ کر دیکھئے، ہر جگہ سرمایہ داری (ملوکیت) اور پیشوائیت کا چولی دامن کا ساتھ نظر آئے گا۔ لہٰذا جب مسلمانوں میں سرمایہ داری نے پھر سے سر نکالا تو اس کے ساتھ ہی پیشوائیت بھی میدان میں آگئی۔ اور اس نے دین کو دھرم سے بدل دیا۔

طلوع اسلام نے جب آئینِ پاکستان کے سلسلہ میں قرآن کے پیش کردہ دین کی طرف دعوت دی تو سرمایہ داری اور

پیشوائیت کی دونوں قوتیں پورے جوش و خروش سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ چونکہ بے نقاب سرمایہ داری ہمیشہ بدنام رہی ہے (اور اس دور میں وہ بدنام سے بدنام تر ہو چکی ہے) اس لئے وہ کھلے بندوں کبھی سامنے نہیں آتی۔ ہمیشہ پیشوائیت کے سائے تلے آگے بڑھتی ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے کے لئے فرعون خود مقابلے کے لئے نہیں آتا۔ ہامان کے منتروں کے ساحرین کو آگے بڑھاتا ہے۔ چنانچہ یہاں بھی یہی ہوا۔

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے۔ پیشوائیت کے پاس اپنے مسلک کی تائید میں علم و بصیرت اور دلائل و براہین نہیں ہوتے وہ فریق مقابل کے خلاف عوام کے جذبات کو بھڑکاتی ہے۔ اور ہنگامہ خیزیوں اور غوغا آرائیوں سے اس کی آواز کو دبانے کا جہاد عظیم شروع کر دیتی ہے۔ تدوین آئین کے سلسلہ میں طلوع اسلام نے جس مسلک کو پیش کیا تھا۔ اس کے خلاف عوام کے جذبات کو مشتعل کر دینا اور بھی زیادہ آسان تھا۔ طلوع اسلام نے کہا یہ تھا کہ

(۱) قرآن کریم نے (بجز چند مستثنیات) دین کے صرف اصول بیان کئے ہیں۔ ان کی جزئیات متعین نہیں کیں۔ اس لئے کہ اصول ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہتے ہیں۔ اور جزئیات زمانہ کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہیں۔ مثلاً قرآن نے زکوٰۃ کا حکم دیا ہے تو اس کی جزئیات کہیں متعین نہیں کیں۔ مقصد یہی تھا کہ ملت کا اسلامی نظام ان جزئیات کو خود متعین کرے۔ اور حسب ضرورت اس میں تبدیلیاں کی جائیں

(۲) ان جزئیات کو سب سے پہلے رسول اللہؐ نے متعین فرمایا۔ حضورؐ کے بعد آپؐ کے خلفائے راشدینؓ نے اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کے پیش نظر جہاں جہاں ضرورت سمجھی۔ ان میں تبدیلیاں بھی کیں اور اضافے بھی۔

(۳) نہ رسول اللہؐ نے اور نہ ہی خلفائے راشدینؓ نے اپنے ان فیصلوں کو محفوظ کر کے ان کا مجموعہ امت کو دیا۔ اس سے بھی ظاہر ہے کہ ان کا منشا یہ تھا ہی نہیں کہ یہ فیصلے ابدالآباد تک غیر متبدل رہیں اگر یہ فیصلے دین کا جزو تھے۔ اور قیامت تک کے لئے امت کے لئے اسی شکل میں واجب العمل، تو کم از کم حضورؐ کا یہ فریضۂ رسالت تھا کہ ان کا مستند مجموعہ محفوظ شکل میں امت کو دیا جاتا۔

ان تصریحات کے بعد طلوع اسلام نے کہا تھا کہ اب اگر پاکستان اپنا نظام علیٰ منہاج نبوت و خلافت راشدہ قائم کرنا چاہتا ہے۔ تو اسے قانون سازی کے لئے یہ اصول مقرر کرنا چاہیے کہ۔

(ا) سب سے پہلے قرآنی اصولوں اور اپنے زمانے کی ضرورتوں کو سامنے رکھا جائے۔

(ب) ہماری مروجہ شریعت میں جو جزئیات ایسی ہیں جو قرآنی اصولوں کے مطابق ہیں۔ اور ہماری ضروریات کو پورا کرتی ہیں۔ انہیں علیٰ حالہٖ رہنے دیا جائے۔ لیکن جو قرآن کے کسی اصول کے خلاف ہوں یا ہمارے زمانے کے تقاضوں کو پورا نہ کرتی ہوں۔ ان میں مناسب رد و بدل یا حک و اضافہ کر لیا جائے۔ اور جوں جوں زمانے کے تقاضے بدلتے رہیں۔ ان میں مناسب تبدیلیاں ہوتی رہیں۔

یہ تھا مختصر الفاظ میں وہ مسلک جو طلوع اسلام نے پیش کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس مسلک میں پیشوائیت کی کہیں گنجائش نہیں رہتی۔ پیشوائیت اپنے آپ کو لاینفک (Indispensable) اس طرح بناتی ہے کہ

(۱) وہ پہلے یہ عقیدہ منواتی ہے کہ مذہب میں جو فیصلہ ایک دفعہ ہو چکا ہے۔ وہ غیر متبدل رہتا ہے۔ اور امت کے لئے اس پر من وعن عمل کرنا ضروری ہوتا ہے۔

(۲) یہ فیصلے کسی ایک جگہ مدون شکل میں موجود نہیں۔ سینکڑوں کتابوں میں بکھرے پڑے ہیں۔ پھر ان میں تضاد بھی ہے۔ بعض ان میں غیر مستند بھی ہیں۔ ان کا علم علماء ہی کو ہو سکتا ہے۔ لہٰذا جب کوئی معاملہ سامنے آئے۔ تو اس کے متعلق علماء ہی سے پوچھنا چاہیئے کہ اس کے متعلق شریعت کا فیصلہ کیا ہے۔ اس فیصلہ کو کتاب وسنت کا فیصلہ کہا جائے گا۔

لہٰذا پیشوائیت کی طرف سے اس مسلک کی مخالفت ہونی ضروری تھی۔ چنانچہ انھوں نے اس کی مخالفت کی اور جی بھر کر مخالفت کی۔ اس کے لئے اگر وہ یہ کہتے کہ ہم اس لئے مخالفت کر رہے ہیں کہ اس سے ہماری ہستی ختم ہو جاتی (یا خطرے میں پڑتی) ہے۔ تو کوئی ان کا ساتھ نہ دیتا۔ اس لئے انھوں نے کہنا یہ شروع کیا کہ اس سے (معاذ اللہ۔ معاذ اللہ) خود ذات رسالت مآب کی رسالت ختم ہو جاتی ہے! آپ سوچئے کہ وہ کون سا مسلمان ہے کہ جب اس سے یہ کہا جائے کہ فلاں شخص (پناہ بخدا) رسول اللہؐ کی رسالت ختم کرنے کے درپے ہے۔ تو اس کا خون کھولنے لگ جائے۔ پیشوائیت اپنی حفاظت کے لئے ہمیشہ خدا اور رسولؐ کے نام کو سپر بناتی ہے۔ ملک کے ارباب بست وکشاد میں اکثر حضرات ایسے ہیں جو طلوع اسلام کے پیش کردہ مسلک کو دین کی صحیح تعبیر سمجھتے ہیں۔ لیکن پیشوائیت نے اس ہنگامہ خیزی کو اس حد تک پہنچا دیا کہ انھوں نے بھی پیشوائیت کا ساتھ دینے میں ہی مصلحت سمجھی۔

اور اس طرح ہمارا یہ آئین جسے دین خداوندی کا منشور بننا تھا، بدقسمتی سے پیشوائیت کے خود ساختہ مذہب کا صحیفہ بن کر رہ گیا۔ چونکہ اس وقت فضا ایسی پیدا کر دی گئی ہے۔ جس میں کسی کو غور وفکر سے کام لینے کی فرصت ہی نہیں۔ اس لئے اس وقت لوگوں کے لئے اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے کہ اس قسم کے غلط اسلامی آئین کے نقصانات کس قدر دور رس ہوتے ہیں۔ اس وقت ہمارے ہاں مذہبی طبقہ میں دو قسم کے لوگ موجود ہیں۔ ایک وہ ہیں جن کا عقیدہ یہ ہے کہ زندگی کا کوئی مسئلہ ایسا نہیں جس کے متعلق پہلے سے کوئی نہ کوئی فیصلہ موجود نہ ہو۔ ان میں سے ایک جماعت کا عقیدہ یہ ہے کہ یہ فیصلے احادیث کے اندر ہیں اور احادیث کے متعلق یہ فیصلہ بھی پہلے سے ہو چکا ہے کہ ان میں سے کونسی صحیح اور کونسی غلط ہیں۔ جن احادیث کو صحیح قرار دیا گیا ہے۔ ان میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کی جا سکتی۔ دوسری جماعت وہ ہے۔ جس کا عقیدہ یہ ہے کہ یہ فیصلے فقہ کی کتابوں میں موجود ہیں۔ اور چونکہ فقہ میں اجتہاد مطلق کا دروازہ بند ہو چکا ہے۔ اس لئے اس حد تک ان فیصلوں میں کوئی ردوبدل نہیں ہو سکتا۔

اگر قانون سازی کے سلسلہ میں یہ گروہ غالب آگیا (خواہ وہ اہل حدیث کا ہو یا اہل فقہ کا) تو آپ کا قانون جامد اور متصلب ہو کر رہ جائے گا۔ اور چونکہ یہ زمانے کی بدلتی ہوئی ضرورتوں کا ساتھ نہیں دے سکے گا۔ اس لئے کچھ وقت کی کشمکش کے بعد ملک کو مجبوراً یہ روش اختیار کرنی پڑے گی کہ مذہب کا دائرہ شخصی قانون (پرسنل لاز) تک محدود ہے۔ اس سے باہر سیاست کا دائرہ شروع ہو جاتا ہے۔ اور سیاسی امور سے متعلق معاملات، مذہب کی دخل اندازی کے بغیر طے پاتے ہیں یعنی مذہب و سیاست کی وہ تفریق جو ہمارے دور ملوکیت میں پیدا ہو گئی تھی، بدستور جاری رہیگی۔

دوسرا طبقہ ہمارے ہاں جماعت اسلامی یا ان کے مویدین پر مشتمل ہے۔ یہ سیاسی جماعت ہے جس کا مقصد اپنی ڈکٹیٹرشپ کا قیام ہے۔ مذہب کو اس مقصد کے حصول کے لئے بطور آلۂ کار استعمال کیا جاتا ہے۔ قانون سازی میں "سنت" کو یہ بھی لاینفک قرار دیتے ہیں لیکن ان کے ہاں اس کی تعبیر عجیب و غریب ہے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ

(۱) سنت رسول اللہ احادیث کے مجموعوں سے اخذ کی جاتی ہے۔

(۲) احادیث کے موجودہ مجموعوں میں غلط اور صحیح ہر قسم کی احادیث مخلوط ہیں۔

(۳) ائمہ حدیث نے صحیح اور غلط حدیثوں کی جو تقسیم کر رکھی ہے۔ وہ کلیتہً قابل اعتماد نہیں کونسی حدیث صحیح ہے اور کونسی غلط، اس کا فیصلہ "مزاج شناس رسولؐ" کی جوہری نگاہ کر سکتی ہے۔

(۴) اور یہ "مزاج شناس رسولؐ" ان کے امیر سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب ہیں۔

یہ کچھ تو وہ اس وقت تک کہتے تھے۔ اب وہ اس سے ایک قدم اور آگے بڑھے ہیں۔ ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ علیکم بسنتی و سنۃ الخلفاء الراشدین المھدیین۔ تم پر میری سنت اور خلفائے راشدین ہدیین کی اتباع واجب ہے۔ اس وقت تک یہی سمجھا جاتا تھا کہ اس حدیث میں خلفائے راشدین سے مراد اولین خلفائے اربعہ (چار خلیفۃ الرسول) ہیں۔ اسی بنا پر سنت رسول اللہ میں سنتِ خلفائے اربعہ کو بھی داخل سمجھا جاتا تھا۔ لیکن اب جماعت اسلامی نے اس حدیث کی تعبیر یوں کی ہے کہ

> خلفائے راشدین میں یہاں متعین اور مخصوص اشخاص مراد نہیں بلکہ آپ کے وہ جانشین مراد ہیں۔ جو آپؐ کے بعد آپؐ کی امت کی زمام کار اپنے ہاتھوں میں سنبھالیں گے۔ اور حضور ہی کے طریقہ پر اپنے فرائض سرانجام دیں گے۔ اس لفظ کے اندر وہ تمام خلفائے راشدین داخل ہیں جو آپؐ کی امت کے اندر پیدا ہوئے یا آئندہ پیدا ہوں گے۔ اور حکومت کے فرائض صحیح اسلامی طریق پر انجام دیں گے۔

(ترجمان القرآن بابت فروری سنہ ۵۶ء صفحہ ۳۳۸)

اس کے ساتھ مودودی صاحب کے اس اعلان کو دیکھئے جو انھوں نے اپنی سرگودھا کی تقریر میں کیا تھا کہ

> اس وقت جماعت اسلامی نے دو بڑے کام کئے ہیں۔ پہلا کام جماعت نے یہ کیا ہے کہ اس نے ملک میں قابلِ اعتماد کیریکٹر رکھنے والوں کو منظم کیا ہے۔ اور یہ وہ چیز ہے جس کی اس وقت ہمارے ملک کو بڑی ضرورت ہے۔ (الاعتصام۔ ۱۵ر جولائی ۱۹۵۵ء)

یعنی جماعت اسلامی نے ملک کے قابل اعتماد کیریکٹر والے لوگوں (صالحین) کو چن چن کر اپنے اندر شامل کر لیا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ ملک میں "حکومت کے فرائض کو صحیح اسلامی طریق پر انجام دینے والے" لوگ جماعت اسلامی کے افراد ہی ہو سکتے ہیں۔ باقی لوگوں کی اکثریت کی حالت یہ ہے کہ "ان کے کیریکٹر اور کردار پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ قومی امانت اور کوئی کام ان کے سپرد کر کے انسان مطمئن نہیں ہو سکتا۔ کوئی قول اور قرار اس خطرے کے بغیر نہیں کیا جا سکتا کہ قول و اقرار کرنے والے صاحب اپنے قول سے پھر نہ جائیں۔ اس کیفیت میں ملک کی عظیم اکثریت مبتلا ہے۔" (ایضاً) جب اقتدار اس جماعت کے ہاتھ میں آئے گا، تو اسے خلافت علیٰ منہاج نبوت کہا جائیگا۔ اور ان کے فیصلے سنتِ خلفائے راشدین میں داخل ہوں گے۔ جن کی اتباع ہر مسلمان پر از روئے کتاب و سنت واجب ہوگی۔

آپ سوچئے کہ جس ملک میں اس قسم کی مذہبی ڈکٹیٹرشپ قائم ہو جائے اس کا حشر کیا ہوگا؟ ہمیں افسوس ہے کہ ہمارے ارباب حل و عقد نے سوچا ہی نہیں کہ وہ آئین کی اس شق کی رو سے کتنے بڑے خطرے کو دعوت دے رہے ہیں۔

(۲) مذہبی فرقے

"کتاب و سنت" کی اس تعبیر کا لازمی نتیجہ تھا کہ مسلمانوں کے مختلف مذہبی فرقوں کو آئینی حیثیت عطا کر دی جائے۔ چنانچہ شق (۱۹۸ (۴)) میں انہیں یہ حیثیت دیدی گئی ہے۔ اس شق میں یہ کہا گیا ہے کہ "جس فرقے سے کوئی شخص متعلق ہوگا۔ اس کے لئے کتاب و سنت کی اسی تعبیر کو صحیح قرار دیا جائے گا۔ جو تعبیر اس فرقے کے نزدیک صحیح ہوگی۔" لیکن اس آئین کی رو سے پاکستان کے ہر مسلمان کو قانوناً کسی نہ کسی فرقے سے متعلق ہونا پڑے گا۔ حالانکہ قرآن کریم بنصِ صریح فرقہ سازی کو شرک قرار دیتا ہے۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ ارباب مذہب میں سے کسی نے اس شق کے خلاف آواز نہیں اٹھائی۔ لیکن وہ اس کے خلاف آواز کس طرح اٹھاتے۔ یہ شق تو خود انہی کی تجویز کردہ ہے۔ چنانچہ "اکتیس علماء" نے جو مسودۂ قانون مرتب فرمایا تھا۔ اس میں اس شق کو خاص طور پر درج کیا گیا تھا۔

آپ نے غور کیا کہ جس چیز کو قرآن واضح الفاظ میں شرک قرار دیتا ہے۔ وہ ہمارے ارباب شریعت کے نزدیک کس طرح متفقہ طور پر عینِ اسلام بن جاتی ہے؟

(۳) ایک اہم سقم

ان اصولی اعتراضات کے علاوہ اس باب میں ایک ایسا سقم ہے۔ جو آگے چل کر بڑی دشواریاں پیدا کر دے گا۔ دستور کی یہ شق یوں ہے کہ

(۱) ملک میں کوئی ایسا قانون نافذ نہیں کیا جائے گا۔ جو کتاب و سنت کے خلاف ہو۔ اور موجودہ تمام

قوانین کو کتاب و سنت کے مطابق بنا دیا جائے گا۔

(۲) اس پر عملدرآمد صرف حسب ذیل طریق سے ہوگا۔ یعنی

(۳) ایک کمیشن بٹھایا جائے گا جو کتاب و سنت کے مطابق قوانین کی فہرست مرتب کرے گا۔ یہ فہرست صوبائی اور مرکزی مجالس مقننہ کی راہ نمائی کا کام دے گی۔

فرض کر لیجئے کہ ایسی فہرست مرتب کر کے مجالس مقننہ کے پاس بھیج دی گئی۔ کمیشن اپنا کام سرانجام دے کر برخاست ہو گیا۔ اس کے بعد کوئی ایسا معاملہ سامنے آیا جس کے متعلق اس فہرست میں کچھ نہیں کہا گیا۔ تو اس کے متعلق کیا ہوگا؟ کیا پھر اسی قسم کا کمیشن بٹھایا جائے گا۔ اور اس کی رپورٹ مجالس مقننہ کے پاس بھیجی جائے گی۔ آئین کی مندرجہ بالا شق کی رُو سے اس کے سوا کوئی دوسری صورت سمجھ میں نہیں آتی۔ کیونکہ اس میں لکھا ہے کہ کتاب و سنت سے متعلق شق پر عمل کرنے کا صرف یہی طریقہ ہے۔

بہرحال یہ طریق کار کا سقم ہے۔ اصولی اسقام وہ ہیں جن کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ آپ ان تصریحات پر ٹھنڈے دل سے غور کیجئے۔ اور پھر سوچئے کہ طلوع اسلام اس آٹھ سال کے عرصہ میں جس معاملہ کی طرف جس تکرار و اصرار سے توجہ دلاتا رہا ہے۔ اس کی نوعیت اور اہمیت کیا ہے۔ اور اس پر اس کے خلاف جو طوفانِ سب و شتم اٹھایا اور کہرام طعن و تشنیع مچایا گیا ہے۔ اس کی اصل حقیقت کیا ہے۔ وہ خطرات جن کی طرف طلوع اسلام نے بار بار توجہ دلائی ہے، جب عملاً سامنے آئیں گے تو ہو سکتا ہے کہ اُس وقت ہم موجود نہ ہوں۔ لیکن ہماری آنے والی نسلیں کم از کم اتنا تو کہہ لیں گی کہ اُس وقت کسی نے قوم کو ان خطرات سے آگاہ کر دیا تھا۔

حرفِ آخر

یہ ہے مختصراً ہماری (بصیرت کے مطابق) دستور پاکستان کا تجزیہ قرآنی روشنی میں۔ جیسا کہ ہم شروع میں لکھ چکے ہیں ہم نے اس تبصرے کی ضرورت اس لئے سمجھی ہے کہ جو لوگ دل سے آرزومند ہیں کہ ہمارا آئین صحیح اسلامی بنیادوں پر استوار ہو انہیں معلوم ہو جائے کہ موجودہ دستور میں (اس نقطۂ نگاہ سے) کیا کیا خامیاں ہیں۔ اور یہ کس شکل میں ترمیم کے بعد اسلامی بن سکتا ہے۔ چونکہ اس دستور میں آئینی طور پر ترمیمات کی گنجائش رکھی گئی ہے۔ اس لئے آئینی جد و جہد سے ایسا کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ایسا وہی لوگ کر سکیں گے جو پہلے اچھی طرح سے خود سمجھیں کہ بات ہے کیا۔ اور پھر وہ اتنی ہمت بھی رکھتے ہوں کہ تمام مخالفتوں کے باوجود پوری جرأت کے ساتھ اسے پیش کر سکیں۔

آوازۂ حق اٹھتا ہے کب اور کدھر سے
مسکیں دلکم ماندہ دریں کشمکش اندر

بہرحال طلوع اسلام تو اپنی بے بضاعتی کے باوجود اس مہم کو جاری رکھے گا ہی۔ وبیدہ التوفیق۔

ترجمہ از احمد امین مصری — مترجم محترم عمر احمد عثمانی صاحب

اسلام کی سرگزشت

باب سوم ———— ایرانی اور ان کے اثرات

[گذشتہ اقساط میں اس سے بحث کی گئی تھی کہ —— اسلامی فتوحات کے زیر اثر بین الاقوامی اختلاط سے مسلمانوں کی عقلی اور دینی زندگی پر کیا اثرات مرتب ہوئے۔ اور مسلمانوں کی زندگی کے کن کن شعبوں کو انھوں نے متاثر کیا۔ اب ہم اپنے موضوع سے متعلق مختلف حرکات —— حرکت عقلیہ وغیرہ (جو اپنے وسیع معنوں میں علم اور دین دونوں کو شامل ہے) —— کے متعلق ذرا تفصیل سے بیان کریں گے —— ایران کا ایک دین تھا۔ ان کی ایک حکمت تھی۔ ان کی اپنی ممتاز عقلیت تھی۔ اسی طرح رومیوں کا بھی ایک دین، علم اور عقلیت تھی۔ اور ان دونوں نے امت اسلامیہ پر بڑے ہی گہرے اثرات مرتب کئے تھے۔ اب ہم ان دونوں کے اثرات کو کسی قدر تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔]

فصل اول

———— ایرانیوں کا دین ————

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔ اسلامی فتوحات کے بعد ایران کی خود مختاری ختم ہو چکی تھی۔ ایران اسلامی مملکت کا ایک حصہ بن چکا تھا۔ لاتعداد ایرانی عربوں کے ہاتھوں گرفتار ہوئے جن میں سے کچھ غلام بنا لئے گئے۔ اور عربوں میں تقسیم کر دیئے گئے[1]۔ ایرانیوں کی اکثریت مسلمان ہو گئی۔ اور انھوں نے عربی زبان سیکھ لی۔ حتیٰ کہ دوسری ہی نسل میں ایسے لوگ پیدا ہو گئے۔ جو عربوں کی طرح بے تکان عربی بول سکتے تھے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ اپنی تمام باتوں میں عربوں کے برابر ہو گئے تھے۔ ان کے عقائد عربوں کی طرح

---

[1] ہم تاریخ کے اس بیان کو صحیح نہیں سمجھتے۔ (طلوع اسلام)

نہیں تھے۔ ان کی تمنائیں، امنگیں، جذبات، رجحانات عربوں کی طرح نہیں تھے۔ اور نہ ہی ان کی عقلیت عربوں کی طرح تھی۔ انھوں نے اسلام کو قبول تو کیا مگر اسلام کو ایرانی رنگ میں رنگ دیا۔ وہ پرانے دین کے جملہ عقائد و تقلیدات سے الگ تھلگ نہیں ہو گئے۔ انھوں نے اسلام کو اسی قدر سمجھا جس قدر ان کا پرانا دین جس پر ان کی قوم پشتہا پشت سے چلی آ رہی تھی۔ انھیں سمجھنے کی اجازت دیتا تھا۔ اسی پرانے دین کے عقائد و تقلیدات میں وہ جوان اور بوڑھے ہوئے تھے۔ ان کی اکثریت نے عربی زبان بھی سیکھ لی تھی لیکن وہ اپنے ایرانی تخیلات کو تو نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ اور اپنی قوم کے اشعار، امثال اور حکم کو تو نہیں بھلا سکتے تھے۔ اس کا فطری نتیجہ یہی تھا کہ اس راستے سے اسلام میں کچھ نئی تعلیمات اور نئے دینی رجحانات داخل ہو جائیں۔ چنانچہ کچھ عرصہ بعد ہی اس کے اثرات ظاہر ہونے لگے۔ اسلام میں ان اثرات کا واضح ترین نمونہ تشیع (شیعی مذہب) اور تصوف تھا۔ نیز یہ بھی اسی کا اثر تھا کہ ادب عربی اس کے بعد ایرانی ضرب الامثال اور حکم، ایرانی کہانیوں اور ایرانی تخیلات میں بری طرح سے ڈوب گیا۔

اس زمانہ میں ایرانیوں کا ایک موثر دین اور با اثر لٹریچر موجود تھا۔ مختصراً ہمیں ان کے دین اور لٹریچر کا جائزہ لے لینا چاہیئے۔ تاکہ ہم اس کے اثرات کو سمجھ سکیں۔ ہمیں یہاں ان کے دین اور لٹریچر اور ان کے تدریجی ارتقاء کا ابتدائی دور سے جائزہ لینے کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ ہمارے مقصد کے لئے کچھ زیادہ مفید نہیں ہوگا۔ بلکہ ہمیں یہاں ان کے دین اور لٹریچر کے صرف اس حصہ کا جائزہ لینا ہے جو ساسانی دور حکومت میں پایا جاتا تھا۔ ساسانی خاندان اسلام سے پہلے ایران پر برسر حکومت تھا۔ اس کی حکومت ۲۲۶ء سے لے کر ۶۵۱ء تک قائم رہی۔ تا آنکہ عربوں نے ان کے ہاتھ سے حکومت چھین لی۔ اور ایران کو اپنے زیر نگیں کر لیا۔ یہ دولت ساسانیہ ہی تھی جس نے دینی اور ادبی ہر جہت سے مسلمانوں پر براہ راست اثر ڈالا تھا۔

ایرانیوں کا دین

ایرانی۔ بلکہ آریائی نسل عموماً۔ اس بات میں مشہور چلے آتے ہیں کہ یہ لوگ دوسری اقوام کی بہ نسبت مظاہر طبیعیہ کی پرستش کی طرف زیادہ رجحان رکھتے ہیں۔ صاف آسمان، روشنی، آگ، ہوا۔ بارش کا پانی ان کے لئے بڑے ہی جاذب نظر ہوتے ہیں۔ اور وہ ان کی پرستش اس عقیدے کے ماتحت شروع کر دیتے ہیں کہ یہ الوہیتی کائنات ہیں۔ چنانچہ وہ سورج کو اللہ کی آنکھ اور روشنی کو اللہ کا بیٹا سمجھتے اور انہی ناموں سے پکارتے ہیں۔ جیسا کہ تاریکی اور قحط سالی کو بھی الوہیتی کائنات سمجھتے اور انہیں شریر اور ملعون گردانتے ہیں۔

اپنے ابتدائی دور سے انھوں نے انسان کو بھلائی کے دیوتاؤں کے سامنے کھڑا کر رکھا ہے۔ جن سے وہ مدد مانگتا ہے۔ ان کے لئے نمازیں پڑھتا ہے۔ ان کی تسبیح و تحمید کرتا ہے۔ اور ان کے سامنے قربانیاں پیش کرتا ہے۔

ان کا خیال ہے کہ خیر اور بھلائی کے دیوتا ہمیشہ شر اور برائی کے دیوتاؤں سے برسر پیکار رہتے ہیں۔ اور انسانوں کے اعمال یعنی ان کی نمازیں وغیرہ شر کے دیوتاؤں سے جنگ کرنے میں خیر کے دیوتاؤں کی مدد و اعانت کرتے ہیں۔ آگ کو انھوں نے روشنی کا رمز قرار دیا ہے۔ بالفاظ دیگر آگ ان کے ہاں خیر کے دیوتاؤں کا ایک مزہ ہے۔ جسے وہ اپنی عبادت گاہوں میں روشن رکھتے اور ان کی امداد کے لئے اسے برابر پھونکتے رہتے ہیں۔ تاکہ خیر کے دیوتاؤں کو قوت حاصل ہو۔ اور وہ شر کے دیوتاؤں پر فتحمند ہو سکیں۔ یہ آگ ان

کہاں ایک شاعرانہ سرسبز خیال کا سرچشمہ تھی۔

(۱) زردشت (ZOROASTER)

اس کے بعد زردشت ـــ ایرانی نبی ـــ آگیا۔ جس نے چند نئی تعلیمات کی طرف لوگوں کو دعوت دی۔ ان تعلیمات کی بنیاد اسی پرانے دین پر تھی۔ جس میں چند اصلاحات کر دی گئی تھیں۔ بہت سے لوگوں کے نزدیک زردشت کا وجود ہی محلِ شک بنا ہوا ہے۔ جن لوگوں نے زردشت کا وجود ثابت کیا ہے ان میں پھر اس میں سخت اختلاف ہے کہ وہ کس زمانہ میں تھے۔ یہ تاریخی اقوال چھ ہزار سال قبل مسیح سے لے کر چھ سو قبل مسیح تک چلے جاتے ہیں۔ پروفیسر جیکسن (JACKSON) نے ان کی زندگی کے بارے میں ایک قابلِ قدر کتاب تصنیف کی ہے[1]۔ اس کتاب نے زردشت کے وجود کو ثابت کرنیوالوں کے پلڑے کو جھکانے میں بڑا کام کیا ہے۔ پروفیسر جیکسن اپنی تحقیق میں اسی نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ زردشت ایک تاریخی شخصیت ہیں۔ ذہنی وجود نہیں ہیں۔ وہ قبیلۂ میڈیا سے تعلق رکھتے تھے (جو ایران کے مغربی شمالی حصہ میں آباد تھا) ساتویں صدی مسیحی کے نصف کے لگ بھگ ان کا دین ظاہر ہوا تھا۔ ان کی وفات ۵۸۳ء قبل مسیح میں ہوئی جبکہ ان کی عمر تقریباً ستتر سال کی تھی۔ ان کا وطن آذربائیجان تھا۔ لیکن ان کو ابتدائی کامیابی بلخ میں حاصل ہوئی جبکہ شہنشاہ لشتاسپ[2] ان کے دین میں داخل ہوگیا۔ اور اس کے بعد ان کا دین بلخ سے لے کر تمام ایران میں پھیلتا چلا گیا۔

تاہم پروفیسر جیکسن کے بعض نتائجِ تحقیق ایسے ہیں۔ جن میں کافی بحث کی گنجائش نکالی جا سکتی ہے۔ زردشتی دین کے پیرو بہت سے معجزات اور خارق عادات و اشارات بیان کرتے ہیں۔ جو ان کی پیدائش کے ساتھ معرضِ وجود میں آئے تھے۔ ان لوگوں کا بیان ہے کہ وہ بچپن ہی سے تدبر اور تفکر کی طرف مائل تھے۔ گوشہ نشینی ان کو مرغوب تھی۔ اس گوشہ نشینی کے دوران میں انھوں نے سات خواب دیکھے۔ اور ان خوابوں کے بعد انھوں نے اپنے رسول ہونے کا اعلان کیا۔ چنانچہ وہ کہا کرتے تھے کہ وہ اللہ کے رسول ہیں جنھیں خدا نے اس لئے بھیجا ہے کہ دین کے ساتھ جو گمراہیاں لاحق ہوگئی ہیں وہ ان کو دور کر دیں اور حق کی طرف لوگوں کو ہدایت کریں۔ بڑا عرصۂ دراز تک لوگوں کو دعوت دیتے رہے۔ لیکن چند لوگوں کے سوا ان کی دعوت کو کسی نے قبول نہیں کیا۔ اس کے بعد ان کو وحی کی گئی کہ وہ بلخ کی طرف ہجرت کر جائیں۔ جہاں پہونچ کر انھوں نے شاہی محلات میں اپنی دعوت کو پھیلایا۔ چنانچہ ابتداءً وزیر کے بیٹوں نے اور پھر ملکہ نے ان کے دین کو قبول کر لیا۔ شاہی محلات کے دوسرے لوگوں نے ان کا مقابلہ کیا۔ اور بہت جھگڑا کیا۔ لیکن جب خود بادشاہ بھی یعنی لشتاسپ بھی ان کے دین میں داخل ہوگیا۔ تو زردشت کو مخالفین کے مقابلہ میں زبردست تقویت حاصل ہوگئی۔ بادشاہ نے جب اس نئے دین کو اختیار کر لیا۔ تو لوگ فوج در فوج ان کے دین میں داخل ہونا شروع ہوگئے۔

زردشت کی تعلیمات

گذشتہ صفحات میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ زردشت سے پہلے ایرانیوں نے اپنے دین کی بنیاد

---

[1] اس کتاب کا نام LIFE OF ZOROASTER ہے۔

[2] شاہنامہ میں اس بادشاہ کا نام گشتاسپ آیا ہے۔

دو امور پر رکھی تھی۔

(۱) اس دنیا کا ایک قانون ہے۔ جس پر وہ چلی جارہی ہے۔ اور اس کے کچھ طبعی ظواہر ہیں جو اپنی جگہ پر ثابت ہیں۔

(۲) یہاں مختلف قوتوں یعنی نور اور ظلمت، شادابی اور قحط سالی وغیرہ میں باہمی نزاع اور تصادم چلا آرہا ہے۔

زردشت کی تعلیمات بھی انہی دونوں بنیادوں پر مبنی ہیں۔ البتہ ان سے پہلے ایرانی بہت سی ارواح خیر کی پرستش کیا کرتے تھے۔ جن کی تعداد کافی تھی۔ زردشت نے ان کو ایک خدا میں جمع کرکے توحید پیدا کردی۔ اور اس کا نام "اَھُورَا مَزدَا" رکھا یہی کچھ قوائے شر کے بارے میں بھی انہوں نے کیا۔ اور ان سب کو ایک چیز میں منحصر کردیا۔ جس کا نام "دروج اھرمن" رکھا اس طرح ان کے نزدیک صرف دو قوتیں باقی رہ گئیں۔ ایک قوتِ خیر اور دوسرے قوتِ شر۔

زردشت کی ایک کتاب مقدس بھی ہے۔ جس کا نام افستا (AVESTA) ہے۔ اس کی ایک شرح بھی ہے۔ جس کا نام "زندافست" ہے۔ مسعودی نے کہا ہے کہ اس کتاب کا نام "الابستا" ہے جب اسے معرب بنالیتے ہیں۔ تو اس میں قاف بڑھا لیتے ہیں۔ اور "الالیستاق" کہتے ہیں۔ اس کی سورتوں کی تعداد اکیس[۱] ہے۔ اور اس کی ہر سورت دو سو ورق پر آئی ہے۔ یہ کتاب قدیم فارسی زبان میں ہے۔ اس زبان کو سمجھنے والا آج کوئی بھی موجود نہیں ہے۔ موجودہ فارسی زبان میں اس کی کچھ سورتیں منتقل کردی گئی ہیں۔ جو آج پارسی لوگوں کے ہاتھوں میں موجود ہیں۔ جنہیں وہ اپنی نمازوں میں پڑھتے ہیں۔ ان میں سے بعض سورتوں میں عالم کے مبداء اور منتہا کے متعلق بیان ہے۔ اور بعض سورتوں میں نصیحت کی باتیں درج ہیں۔

افستا کی اصل اور اس کے حقیقی مصنفین کا مسئلہ خود زردشت کے وجود کی طرح محققین کے مابین ہمیشہ سے محل بحث رہا ہے "برسیوں" کا کہنا ہے کہ "افستا دولت ساسانیہ کے عہد میں ایک تصنیف تھی۔ جس میں اکیس سورتیں تھیں۔ لیکن آج ہمارے زمانے میں ان میں سے صرف ایک مکمل سورت اور مختلف سورتوں کی چند آیات باقی رہ گئی ہیں۔ یہ جو کچھ ہم تک پہنچا ہے۔ صرف چند مقطعات پر مشتمل ہے۔ جن کا تعلق شعائر دینی اور زردشتی معابد کے قوانین سے ہے۔

فتح کے وقت مسلمانوں نے ان سے وہی معاملہ کیا جو اہل کتاب کے ساتھ کیا جاتا تھا۔ انہوں نے ان کی کتاب کو ایسا ہی شمار کیا ہے گویا وہ ایک آسمانی کتاب ہے۔ حضرت عمرؓ کا یہ طرزِ عمل اس لئے تھا کہ ان کے سامنے رسول اللہ صلعم کی یہ حدیث بیان کی گئی تھی کہ "مجوسیوں کے ساتھ اہل کتاب کا سا برتاؤ کرنا"

ان کی تعلیمات میں مشہور یہی ہے کہ زردشت کہا کرتے تھے کہ اس دنیا کی دو اصلیں یا دو خدا ہیں (۱) خیر کی اصل اور وہ "اہورا" یا "اہورامزدا" ہے اور (۲) شر کی اصل اور وہ "اہرمن" ہے۔ یہ دونوں مسلسل جنگ میں لگے ہوئے ہیں۔ یہ

(۱) مسعودی میں یا کے ساتھ اسی طرح لکھا گیا ہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ الالیستاق میں یا غلط ہے اور صحیح با ہے۔ کیونکہ فارسی زبان میں واو عادۃً با سے بدل جاتی ہے۔ لہٰذا اس لفظ کی صحیح کتابت "الابستاق" ہوگی۔

دونوں اصلیں یا دونوں خدا تخلیق کرنے کی قدرت رکھتے ہیں۔ چنانچہ خیر کی اصل تو وہ ہے جس نے ہر وہ چیز پیدا کی ہے۔ جو اچھی ہے، بھلی ہے اور نافع ہے۔ چنانچہ اس نے نظام کو پیدا کیا۔ حق کو پیدا کیا۔ روشنی کو پیدا کیا۔ پہرہ دینے والے کتے کو اور مرغ کو پیدا کیا۔ اور مؤمن کا فریضہ ہے کہ ان چیزوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرے۔ اور اس کے برعکس شر کی اصل ظلمت اور تاریکی ہے۔ اس نے وہ تمام چیزیں پیدا کیں جو دنیا میں بری ہیں۔ چنانچہ اس نے درندہ جانوروں کو، سانپوں اور اژدھوں کو حشرات الارض اور ہوام کو پیدا کیا۔ مؤمن کا فریضہ ہے کہ جہاں انہیں پائے قتل کر دے۔ ان دونوں روحوں کے درمیان مسلسل جنگ برپا ہے جس میں کبھی اس کو فتح ہوتی ہے۔ اور کبھی اس کو۔ لیکن آخری فتح خیر کی روح کو ہی حاصل ہوگی۔ اس جنگ میں انسان ان دونوں روحوں کے درمیان بٹ جاتے ہیں۔ کچھ ایسے ہیں جو اہورا کی مدد کرتے ہیں۔ اور کچھ ایسے ہیں جو اہرمن کی مدد کرتے ہیں۔ یہ دونوں روحیں بذات خود جنگ میں حصہ نہیں لے رہی ہیں بلکہ اپنی اپنی مخلوقات کے ذریعہ سے جنگ کر رہی ہیں۔

ان دونوں روحوں کے درمیان انسان محل نزاع بنا ہوا ہے۔ کیونکہ اسے مزدا نے پیدا کیا ہے۔ لیکن مزدا نے اسے ارادہ کا آزاد پیدا کیا ہے۔ لہٰذا اس کے لئے قطعاً ممکن ہے کہ وہ شریر قوتوں کا تابع فرمان ہو جائے۔ انسان کو اس کی زندگی میں دونوں قوتیں اپنی اپنی طرف کھینچتی ہیں۔ اگر اس نے دین حق کو قبول کر لیا۔ اور نیک اعمال کئے اور اس طرح اپنے بدن اور روح کو پاک و صاف کر لیا۔ تو اس نے شر کی روح کو ذلیل کر دیا۔ اور خیر کی روح کی مدد کی۔ اور اس طرح مزدا کی طرف سے ثواب کا مستحق ہو گیا۔ ورنہ اس نے شر کی روح کو قوت بہم پہنچائی۔ اور اپنے اوپر مزدا کو ناراض کر لیا۔

زردشتی مذہب کے اہم ترین مبادی میں سے یہ عقیدہ بھی ہے کہ انسان کا افضل ترین عمل زراعت اور چوپایوں کی خدمت ہے۔ چنانچہ اس مذہب نے لوگوں میں کھیتی باڑی کو محبوب اور مقبول ترین پیشہ بنانے میں بڑا کام کیا۔ لوگوں کو ترغیب دی کہ وہ اپنے چوپایوں کے ساتھ زندگی بسر کریں۔ لوگوں کو سعی و کاوش اور عمل کا شوق دلایا حتیٰ کہ اپنے متبعین پر روزہ رکھنے کو حرام قرار دیدیا کیونکہ اس سے ان کی قوت عملیہ میں کمزوری پیدا ہوتی ہے۔ اور زردشتی دین انہیں طاقتور اور عملی پیکر بنا ہوا دیکھنا چاہتا ہے۔

زردشت کی یہ بھی تعلیم تھی کہ پانی۔ ہوا۔ آگ اور مٹی پاک عناصر ہیں۔ جن کے لئے ضروری ہے کہ وہ ناپاک نہ ہوں۔ اسی کے مظاہر میں سے آگ کی تقدیس کا عقیدہ اور اس کو بطور رمز کے اختیار کر لینا ہے۔ بہتا پانی ان کے نزدیک ناپاک نہیں ہو سکتا نیز زمین میں مُردوں کا دفن کرنا حرام ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

انسان کی دو زندگیاں ہیں۔ ایک حیات اولیٰ ہے۔ جو دنیا میں ہوتی ہے۔ اور دوسری حیات اخروی ہے جو موت کے بعد ہوتی ہے۔ حیات آخرت میں انسان کا حصہ دراصل ان اعمال کا نتیجہ ہوتا ہے۔ جو اس نے اپنی دنیوی زندگی میں کئے ہوتے ہیں اس کے تمام اعمال ایک نامۂ اعمال میں درج کئے جاتے ہیں۔ اور اس کی برائیاں ایک الگ دفتر میں شمار کی جاتی ہیں۔ موت کے بعد تین روز تک روح انسانی اپنے جسم کے اوپر منڈلاتی رہتی ہے، اور اسے سعادت و شقاوت اپنے اعمال کے مطابق نصیب ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے تین دن تک خصوصیت کے ساتھ خاص دینی شعائر ادا کئے جاتے ہیں۔ تاکہ روح عالم

آخرت سے مانوس ہو سکے۔ حساب کے وقت روح انسانی ایک راستہ پر سے گذرے گی جو جہنم کے دہانہ پر نصب کر دیا گیا ہوگا۔ یہ راستہ مومن کے لئے وسیع و عریض ہوگا۔ جس پر سے گذرنا آسان ہوگا۔ اور کافر کے لئے بال سے زیادہ باریک ہوگا۔ جو لوگ ایمان لائے ہوں گے اور جنہوں نے نیک عمل کئے ہوں گے۔ وہ سلامتی کے ساتھ اس راستہ پر سے گذر جائیں گے۔ اور "اہورا" سے ملاقات کریں گے۔ "اہورا" ان سے بہت اچھی طرح ملاقات کرے گا۔ اور انہیں عزت کے مقام پر اتارے گا۔ لیکن جو ایمان نہیں لائیں گے اور جنہوں نے نیک عمل نہیں کئے ہوں گے۔ وہ جہنم میں گر پڑیں گے۔ اور اہرمن کے غلام بن جائیں گے۔ اگر اس کی نیکیاں اور بدیاں برابر سر برابر ہوں گی۔ تو اس کی روح اعراف میں جا کر رہے گی۔ تا آنکہ فیصلہ کا دن آجائے۔

دنیوی زندگی میں انسان کی نگاہوں سے وہ تمام نعمتیں اوجھل کر دی گئیں ہیں۔ جو اس کے لئے مرنے کے بعد دوسری زندگی میں خدا نے تیار کر رکھی ہیں۔ انسان میں یہ صلاحیت نہیں ہے کہ وہ نیکی اور بدی میں تمیز کر سکے۔ یہ خدا کی رحمت ہے کہ وہ اپنے رسول بھیجتا ہے۔ جن کے ذریعے سے وہ لوگوں کو ہدایت دیتا ہے۔ زردشتی قصوں کہانیوں میں یہ بھی مذکور ہے کہ نبوت ابتداءً جمشید شہنشاہ ایران پر نازل کی گئی تھی لیکن وہ اس بار کو اٹھا نہیں سکا۔ اور ان کی جگہ زردشت نے اسے اٹھالیا۔ چنانچہ خدا ان سے باتیں کرتا اور ان پر وحی نازل کرتا تھا۔

زردشت کی تعلیم یہ بھی تھی کہ قیامت کا دن قریب آچکا ہے۔ اور اس زندگی کی انتہا کچھ زیادہ دور نہیں ہے۔ وہ وقت جلد آرہا ہے جب "مزدا" اپنی قوت کو مجتمع کر کے شر کے دیوتا پر فیصلہ کن حملہ کرے گا۔ اور اسے شکست دے کر اسے اور اس کے فرماں برداروں کو جہنم میں عذاب دے گا۔

زردشت کا فلسفہ

ان دینی تعلیمات کے پہلو بہ پہلو دین زردشتی میں ہمیں وہ بحثیں بھی ملتی ہیں۔ جن کا تعلق ماورا مادہ سے ہے۔ لیکن اس باب میں اس کی بحثیں ایسی جامع نہیں ہیں۔ جیسا کہ یونانیوں کے ہاں ہمیں ملتی ہیں۔ بلکہ محض جزئی بحثیں ہیں جو ادھر ادھر بکھری ہوئی ہیں۔ ان بحثوں میں ہمیں وہ خصوصیت بھی ملتی ہے جو اسلام کے بعد عربوں میں بھی ہمیں نظر آتی ہے۔ یعنی یہ لوگ ماورا مادہ سے متعلق بحثوں کو دین کے ساتھ خلط ملط کر دیتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ اس کی مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ماورا مادہ سے متعلق وہ یونانیوں کی طرح مستقل بحث نہیں کرتے۔

زردشتیوں نے جو فلسفی بحثیں کی ہیں۔ ان میں روح انسانی کی بحث بھی شامل ہے۔ دین زردشتی کی رائے میں نفس انسانی کو خدا نے عدم سے پیدا کیا اور اس میں یہ استطاعت رکھدی ہے کہ اگر وہ زمینی دنیا میں شرور سے جنگ کرتا ہے تو اس طرح حیات سرمدی اور حیات سعیدہ حاصل کر سکتا ہے۔ خدا نے اسے ارادہ کی آزادی بھی عطا فرمائی ہے۔ وہ اپنے اختیار اور ارادہ سے خیر کو بھی پسند کر سکتا ہے اور شر کو بھی۔ نفس انسانی میں مختلف قوتیں ہیں جن میں سے چند کے نام یہ ہیں (۱) ضمیر اور وجدان (۲) قوت حیویہ (۳) قوت عقلیہ (۴) قوت روحیہ (۵) قوت حافظہ وغیرہ۔

اس کے بعد یہ مسئلہ قابل غور ہے کہ آیا دین زردشت ثنوی دین ہے۔ جس کے خیال میں دنیا پر دو خداؤں کی حکمرانی چل رہی

ہے۔ ایک الٰہ خیر کی اور دوسرے الٰہ شر کی۔ اور یہ کہ ہر الٰہ کی اپنی ایک مستقل ذات ہے۔ یا دین زردشت موحد دین ہے جس کے خیال میں ایک ہی خدا کی حکمرانی چل رہی ہے۔ اور دنیا میں جو کچھ خیر و شر نظر آتا ہے۔ یا ان دو برسرِ پیکار قوتوں کے متعلق جو کچھ ہم محسوس کرتے ہیں۔ وہ دراصل ایک ہی خدا یا الٰہ کے دو مظہر یا دو اثرات ہیں؟ اس سوال کے جواب میں محققین میں بڑا اختلاف ہے۔ اکثر محققین کی رائے یہی ہے کہ یہ دین، ثنوی دین ہی ہے۔ جیسا کہ اس کی ظاہری عبارتوں سے معلوم ہوتا ہے۔ اسی رائے کی طرف یورپ کے بعض مصنفین کا رجحان بھی ہے۔ چنانچہ دائرۃ المعارف البریطانیہ (انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا) میں بہت سے محققین نے مادۂ زردشت کے ماتحت انہی خیالات کا اظہار کیا ہے۔ لیکن کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو زردشت کو موحد تسلیم کرتے ہیں۔ چنانچہ شہرستانی کی یہی رائے ہے اور قلقشندی نے بھی صبح الاعشیٰ میں اسی رائے کو ترجیح دی ہے۔ پروفیسر ہوج (HAUG) کہتے ہیں کہ "زردشت لاہوتی جہت سے تو موحد ہیں مگر فلسفی جہت سے ثنوی ہیں۔ پروفیسر ہوج کا مطلب اپنے اس قول سے غالباً یہی ہے کہ وہ دینی عقیدے کی جہت سے تو یہی سمجھتے تھے کہ عالم کا الٰہ ایک ہی ہے۔ لیکن جب وہ فلسفۂ عالم کی شرح کرنے پر آتے تھے۔ اور دیکھتے تھے کہ یہاں خیر اور شر میں برابر تصادم ہو رہا ہے۔ اور اس سے کیا کیا نتائج مرتب ہو رہے ہیں تو وہ ثنوی بن جاتے ہیں۔ اور اس خیال کے مؤید بن جاتے ہیں۔ کہ اس عالم میں دو قوتیں کارفرما ہیں۔

زردشتی دین ہی ایران کا سربرآوردہ مذہب تھا۔ اور کیانیوں (ACHAEMENIAN) کے عہد میں ایران اور اس کے اردگرد کے علاقہ پر یہی دین چھایا ہوا تھا۔ اسکندر نے سنہ ۳۳۱ قبل مسیح میں فتحیابی حاصل کی تو اس سے جہاں کیانیوں کے خاندان حکومت کو پسپائی نصیب ہوئی۔ وہیں زردشتی دین کو بھی کافی صدمہ اٹھانا پڑا لیکن کچھ عرصہ کے بعد ساسانیوں کے عہد حکومت میں جو سنہ ۲۲۶ء سے شروع ہوتا ہے۔ دین زردشتی نے حیات نو حاصل کی۔ اور اسلامی فتوحات کے عہد تک پورے ایران کا یہی مذہب رہا۔ اسلامی فتوحات کے بعد بہت سے لوگوں نے اسلام قبول کر لیا۔ البتہ کچھ لوگ ابتداءً خلیج فارس کے جزیروں میں بھاگ گئے۔ اور پھر وہاں سے انہوں نے ہندوستان کا رخ کیا۔ چنانچہ آج تک بمبئی میں ان کی جماعت موجود ہے۔ جو پارسی (PARSEES) کہلاتے ہیں۔ یہ لوگ آج تک اپنے اسی زردشتی دین پر قائم ہیں۔ اس کے علاوہ فتوحات اسلامی کے بعد خود ایران میں بھی بہت سے ایسے لوگ موجود تھے جو اپنے قدیم مسلک پر قائم تھے۔ چنانچہ ایران کے ہر صوبے میں ان کے آتش کدے فتوحات اسلامی کے بعد سے ابتدائی تین صدیوں تک باقی تھے[1]۔

---

[1] تیسری صدی ہجری کے آخر اور آٹھویں صدی مسیحی کے آخر میں ساسان امیر بلخ جو زردشتی تھا مسلمان ہو گیا۔ اور اس نے ایک اسلامی مملکت کی بنیاد رکھی جو دولت سامانیہ کے نام سے مشہور ہے۔ سنہ ۳۰۰ھ میں اہل دیلم کی ایک بڑی جماعت جو زردشتی تھے۔ ناصر الحق ابو محمد کے ہاتھ پر اسلام میں داخل ہوئی سنہ ۳۰۴ھ۔ ۹۱۶ء حسن بن علی نے ـــــ ان کا تعلق اس علوی خاندان سے تھا۔ جس کی حکومت بحر قزوین کے جنوبی کنارہ (باقی اگلے صفحہ پر)

سطور بالا میں ان کے مذہب کا اجمالی تذکرہ پڑھنے کے بعد آپ نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ مسلمانوں پر انھوں نے کتنا گہرا اثر چھوڑا تھا اس کی مزید وضاحت ہم آگے چل کر کریں گے۔ جہاں ہم دینی مذاہب پر کلام کریں گے۔ تاہم اجمالاً یہاں ہم اتنا کہہ دینا چاہتے ہیں کہ پل صراط کے بارے میں عام مسلمانوں کا عقیدہ اس تفصیل کے ساتھ جو زردشت نے بیان کی ہے۔ نیز اعراف کے بارے میں بھی مسلمانوں کے عقائد، جسم کے اوپر روح کے منڈلاتے رہنے کا تصور۔ اور اس مقصد سے تین دن تک خصوصی شعائر و مراسم کی ادائیگی یہ تمام ایسے عقیدے ہیں۔ جو دین زردشتی سے پوری پوری مشابہت رکھتے ہیں۔ اسی طرح جبر و اختیار کے بارے میں معتزلہ کے اقوال روح اور نفس کی اقسام کے بارے میں صوفیوں کے ارشادات ـــــ معاف فرمائیے گا ـــــ سب کا سب اسی دین سے ماخوذ ہے اس موضوع پر ہم انشاء اللہ کسی دوسرے مقام پر جہاں اس کا موقع ہوگا، مزید روشنی ڈالیں گے۔

(حاشیہ بقیہ گذشتہ صفحہ) پر قائم تھی۔ اہل دیلم اور اہل طبرستان کو اسلام کی طرف دعوت دی جسے اکثر لوگوں نے قبول کر لیا۔ ان میں سے کچھ بت پرست تھے اور کچھ زردشتی تھے۔ ۱۰۰۳ء (۳۹۳ھ) میں مشہور شاعر میہار دیلمی نے امام شریف رضی کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔ میہار دیلمی آتش پرست تھا۔ اس سے پہلے دوسری صدی ہجری کے شروع (آٹھویں صدی مسیحی کی ابتداء) میں عبداللہ ابن المقفع زردشتی مذہب سے اسلام میں داخل ہو چکا تھا۔ بعض زردشتی ایران میں اب تک بھی موجود ہیں۔ قریبی زمانہ میں ان کا اندازہ لگایا گیا تھا تو معلوم ہوا کہ ایران میں تقریباً ۸۵۰۰ افراد اب تک بھی آگ کی پرستش کرتے ہیں۔

اعجاز القرآن

از:- علامہ تمنا عمادی مدظلہ

جس میں مختلف جہات سے قرآن کے اعجاز پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کی چند اقساط ماہوار طلوع اسلام میں آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ ناظرین کے مسلسل اصرار پر اب اسے کتابی شکل میں شائع کیا گیا ہے۔

سائز ۲۰×۳۰/۸ ضخامت ۱۱۲ صفحات۔ قیمت غیر مجلد ایک روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول ڈاک

ناظم ادارہ طلوع اسلام ۱۵۹/۳۔ ایل۔ پی ای سی ایچ سوسائٹی کراچی

مجلسِ اقبال

(باب ہشتم ۔ مسلسل)

زیرِ نظر باب کے گذشتہ حصہ میں علامہ اقبال نے یہ بتایا ہے کہ شاعر کس طرح قوم کو افیون گھول گھول کر پلاتے رہتے اور اس طرح ان کے قوائے عملیہ کو مضمحل، ان کے حوصلوں کو پست اور دلوں کو سرد کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد وہ براہِ راست مسلمان سے مخاطب ہوتے ہیں اور اسے کہتے ہیں کہ

اے زپا افتادۂ صہبائے او
صبحِ تو از مشرقِ مینائے او

اس شاعر کی شراب نے تجھے بھی میدانِ زندگی میں پاؤں سے اکھیڑ دیا۔ اس کے نشے سے تیرے پائے ثبات میں لغزش آگئی۔ تو اپنے مقام سے گر گیا۔ تیری دنیا کی صبح، خدا کی کتاب منیر کے درخشندہ آفتاب کے بجائے انہی شاعروں کی شراب کی صراحی سے روشن ہے۔

اے دلت از نغمہ ہائش سرد و خوش
زہرِ قاتل خوردۂ از راہِ گوش

اس شاعر کے نسخوں نے تیرے سینے کی حرارتوں اور دل کے ولولوں کو یکسر ٹھنڈا کر دیا۔ اس نے تجھے کانوں کے راستے زہرِ ہلاہل پلایا اور تو موت کی نیند سو گیا۔

اے دلیلِ انحطاط انداز تو
از نوا افتادۂ تارِ ساز تو

اب تیری زندگی کے ہر انداز اور اسلوب سے تیری پستی اور زوال ہویدا ہے۔ تیری صورت سے پتہ چل جاتا ہے کہ تو دنیا میں کس قدر ذلیل و خوار ہو چکا ہے۔ اس کے لئے کسی تحقیق کی ضرورت ہے نہ تفتیش کی۔ نہ دلیل کی حاجت ہے۔ نہ شہادت کی کَفٰی بِنَفْسِکَ اَلْیَوْمَ عَلَیْکَ حَسِیْبًا (۱۷/۱۴) تیری اپنی ذات تیرے حساب کتاب کی آئینہ دار ہے۔ تیرے ساز زندگی کے تار اتر چکے ہیں اس

لئے ان سے جو آوازیں نکلتی ہیں، وہ نغمۂ ہستی سے ہم آہنگ نہیں، نہ ان کا سُر درست ہے نہ تال۔ اور چونکہ موسیقی نام ہی سُروں کی ہم آہنگی کا ہے، اس لئے بزم کائنات میں تیرا ساز بہت بے سُرا ہو چکا ہے تو زمانہ کے ساتھ چلنے کے قابل ہی نہیں رہا۔ اس شاعری نے تیری حالت یہ کردی ہے کہ

آں چناں زار از تن آسانی شدی
در جہاں ننگِ مسلمانی شدی

تو قوتِ عمل سے محروم ہو چکا ہے۔ اور تن آسانی نے تجھے سخت ضعیف و ناتواں بنا دیا ہے اور تیرا وجود خود اسلام کے لئے باعثِ شرم ہو چکا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام اپنے اندر اس قدر کشش و جاذبیت رکھتا ہے کہ اسے جس قوم کے سامنے پیش کیا جائے ہو نہیں سکتا کہ وہ اس سے متاثر نہ ہو۔ لیکن آج جس قوم کے سامنے اسلام کا نام لو، وہ فوراً کہہ دیتی ہے کہ اگر یہ دین اتنا ہی زندگی بخش اور نتیجہ خیز ہے تو دنیا میں مسلمانوں کی حالت ایسی کیوں ہے؟ اس طرح مسلمانوں کی زبوں حالی سے خود اسلام بدنام ہو چکا ہے۔ آج تیری کمزوری و ناتوانی کا یہ عالم ہے۔

از رگِ گل می تواں بستن ترا
از نسیمے می تواں خستن ترا

تیرے جکڑ دینے کے لئے رگِ گل سی نرم و نازک "زنجیر" بھی کافی ہے۔ اور تجھے گھائل کر دینے کے لئے بادِ نسیم کا ہلکا سا جھونکا بھی بہت ہے۔ اقبالؔ نے یہاں طنزاً جن چیزوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ان کی تفاصیل معلوم کرنا چاہو تو ہمارے شعراء کی نازک خیالیوں پر ایک نگاہ ڈالو۔ کہیں سے آپ کو یہ آواز سنائی دے گی کہ

تنم از ضعف چناں شد کہ تفاجست دنیافت
نالہ ہر چند صدا داد کہ در پیرہن است

اور کہیں سے یہ شکایت کہ

غنچہ چٹکا تو کہا سر میں دھمک ہوتی ہے

لیکن اگر ہم اس افسانوی دنیا سے حقیقت کی طرف آئیں تو وہاں مسلمانوں کی عملاً یہی حالت ہو چکی ہے۔ انہیں محکومی اور غلامی کی زنجیروں میں مقید رکھنے کے لئے کسی بڑی طاقت کی ضرورت نہیں۔ یورپ میں جو قومیں کسی گنتی شمار میں بھی نہیں، وہ بھی مسلمانوں کے بڑے بڑے ممالک کو اپنے پنجۂ استبداد میں اس طرح دبائے ہوئے ہیں کہ ان سے رستگاری کی کوئی صورت ہی نظر نہیں آتی۔ ذرا سوچئے کہ یہودیوں جیسی رسوائے عالم قوم، جو دو اڑھائی ہزار سال سے دربدر مارے مارے پھر رہی تھی۔ وہ پورے عالمِ اسلامی کے قلب میں خنجر بھونک کر بیٹھی ہے۔ اور مسلم ممالک کی تمام تڑپ اور پھڑک ان میں بال بھر جنبش نہیں پیدا کر سکی۔ اسرائیل کی قوت "رگِ گل" کیا تارِ عنکبوت سے بھی زیادہ حقیقت نہیں رکھتی۔ لیکن مسلمان کو پکڑنے اور جکڑنے کے لئے یہ بھی کم نہیں۔

مسلمان کی اس کمزوری اور ناتوانی کی طرف اشارہ کرنے کے بعد حضرت علامہ پھر اسی مضمون کی طرف رجوع کرتے ہیں جسے انھوں نے اس سے پہلے شعر میں چھیڑا تھا۔ یعنی یہ کہ مسلمان کا وجود خود اسلام کے لئے باعث ننگ ہو چکا ہے اس ضمن میں دیکھتے ہیں

عشق رسوا گشتہ از فریاد تو
زشت رو تمثالش از بہزاد تو

تیری فریاد سے دنیا میں خود عشق رسوا ہو گیا ہے۔ تو ایسا مصور ہے کہ تیرے موئے قلم نے عشق کی اس قدر حسین و جمیل تصویر کو سخت بدنما بنا دیا ہے۔

زرد از آزارِ تو رخسارِ او
سردیٔ تو بردہ سوز از نارِ او

تیری بیماری اور ناتوانی نے عشق کے تمتماتے رخسار پر بھی زردیاں چھڑک دی ہیں۔ تیرے سینے کی سردی نے خود عشق کی آگ کو حرارت سے محروم کر دیا ہے۔

خستہ جاں از خستہ جانی ہائے تو
ناتواں از ناتوانی ہائے تو

تیری بےکسی اور بےبسی، خستگی اور بیچارگی، پستی اور زبوں حالی سے دنیا اس نتیجے پر پہونچ رہی ہے کہ اسلام کی وجہ سے اور وہ دین (معاذ اللہ) اس قابل ہی نہیں کہ زندہ قوموں کے لئے دلیل راہ بن سکے۔ جو اس کی اتباع کرے گا، اس کا بھی وہی حشر ہو جائے گا جو مسلمانوں کا ہوا ہے۔

اس کے بعد علامہ اقبال پھر اسی موضوع کی طرف عود کرتے ہیں، جس سے انھوں نے اس بند کا آغاز کیا تھا، یعنی اس قسم کے شاعر نے مسلمان کو تباہ و برباد کر دیا ہے۔ اسی شاعر (اور شاعری) کے متعلق وہ کہتے ہیں۔

گریۂ طفلانہ در پیمانہ اش
کلفتِ آہے متاعِ خانہ اش

اس شاعر (یا مصنوعی عاشق) کی کیفیت کیا ہے؟ یہ ہجر کے صدموں سے بچوں کی طرح سسکیاں لیتا ہے اور آنسو بہاتا ہے —— ہم راتوں کو اٹھ کر روتے ہیں جب سارا عالم سوتا ہے۔ اسے جب دیکھو نالہ و فریاد کرتا اور ٹھنڈی آہیں بھرتا دکھائی دے گا یہ اپنے جھوٹے رونے سے ساری قوم کو سیاہ پوش بنا دیتا ہے۔

سر خوش از دریوزۂ میخانہ ہا
جلوہ دزدِ روزنِ کاشانہ ہا

یہ شراب خانوں سے بھیک مانگتا ہے۔ اور اس طرح حاصل کردہ شراب کے نشہ میں مست رہتا ہے بلکہ اس پر فخر کرتا ہے کہ

شریف کعبہ رہا ہے کئی برس اے شیخ
یہ تیرا ب جو گدا ہے شراب خانے کا

اس کی دنائت کا یہ عالم ہے کہ محبوب کے گھر کے روشندانوں اور دروازوں کی درازوں سے جھانک کر لذتِ دیدار حاصل کرتا ہے۔

کھینچ لینا وہ مرا پردے کا کونا دفعتاً
اور دوپٹے سے ترا وہ منہ چھپانا یاد ہے

اس کی حالت یہ ہوتی ہے کہ

ناخوشے۔ افسردۂ۔ آزردۂ
از لگدکوبِ غمِ ہجراں مردۂ

جب دیکھئے تو یہ عالم کہ — حسرت برس رہی ہے رخِ نامراد پر — جب سنیئے تو یہ کیفیت — کہ ایک بات کہے اور دو گھڑی روئے — جب حالت پوچھئے تو یہ جواب کہ اب تو جی یہ چاہتا ہے کہ — آئے مجھے ہنسی بھی تو میں رو دیا کروں۔
ہمت اور غیرت کا یہ عالم کہ یار کے دروازے پر دربان سے پٹ کر آ گئے۔

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئی
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے

حالت یہ کہ

از غماں مانندِ نے کاہیدۂ
وز فلک صد شکوہ بر لب چیدۂ

فرطِ غم واندوہ سے سوکھ کر کانٹا ہو رہے ہیں۔ جب دیکھئے فلکِ ناہنجار کی ستم رانیوں کا شکوہ لب پہ ہے۔ خود بھی رو رہے ہیں۔ دوسروں کو بھی رلا رہے ہیں۔ افسردہ دل افسردہ کند انجمنے را۔

تا بہ دکیں جوہرِ آئینہ اشس
ناتوانی ہمدمِ دیرینہ اشس

اس کی آئینہ سخنی کی آب وتاب۔ تملق اور خوشامد کی رہینِ کرم ہوتی ہے۔ اس لئے کہ وہ بیحد کمزور و ناتواں ہوتا ہے۔ اور کمزور خوشامد کے سوا اور کچھ جانتا ہی نہیں۔

پست بخت و زیردست و دوں نہاد
نامزا و نا امید و نامراد

بدنصیب اور کمزور اور اس وجہ سے کمینہ فطرت۔ نالائق۔ نامراد اور ہمیشہ ناامید۔

شیونش از جانِ تو سرمایہ برد
لطفِ خواب از دیدۂ ہمسایہ بُرد

اس کی اپنی حالت تو یہ تھی ہی۔ اس کی مسلسل گریہ وزاری اور شیون وفریاد سے خود تیری حالت یہ ہوگئی کہ تجھ میں بھی متاعِ زندگی اور سوزِ حیات کی کوئی رمق باقی نہ رہی۔ وہ خود تو راتوں کو جاگتا ہی تھا۔ اس کی آہ وزاری نے ہمسایوں کی نیند بھی خراب کردی۔ وہ بچارے رہ رہ کر پکار اٹھتے کہ

پھر چھیڑا حسن نے اپنا قصہ　　　لو آج کی شب بھی سو چکے ہم

یہ ہے نقشہ ان شاعروں کا۔ اور یہ ہے ماحصل اس شاعری کا۔ جس سے مسلمان صدیوں سے متاثر چلا آرہا ہے۔ اور جس نے اس کی حالت یہ کردی ہے کہ بصورت ببیں حالم مپرس۔ علامہ اقبال نے یہ کچھ شاعر کے متعلق بھی کہا ہے۔ اور چونکہ شاعر اپنے آپ کو عشق کا ترجمان کہتا ہے۔ اس لئے یہی کچھ انہوں نے خود عشق کی بابت کہا ہے جسے یہ شاعری پیش کرتی ہے۔ اس جہت سے مندرجہ صدر اشعار کا روئے سخن اس "عشق" کی طرف بھی ہے۔ جس کی تفصیل ہماری شاعری سے مرتب ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے انہوں نے اس بند کے آخری شعر میں کہا ہے کہ

وائے بر عشقے کہ نارِ او فسرد
در حرم زائید۔ در بت خانہ مُرد

کس قدر قابلِ تاسف ہے حالت اس عشق کی جس کی آگ اس طرح بجھ جائے۔ آہ! وہ عشق جس نے حریمِ کعبہ میں جنم لیا اور وہ بت خانہ میں پہنچ کر اس طرح مرگِ بے شرف کا شکار ہو گیا۔

اس شعر سے پھر یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ عشق سے حضرت علامہ کا اشارہ خود اسلام کی طرف ہے۔ ایک وہ اسلام تھا جس کا سرچشمہ کعبہ تھا۔ یعنی خالص اسلام جو کسی غیر قرآنی تصور سے ملوث نہیں ہوا تھا۔ وہ اسلام زندگی اور توانائی کا علمبردار اور حرکت و حرارت کا پیامبر تھا۔ لیکن وہی اسلام جب عجم کے بتکدوں میں پہنچا تو خود بھی راکھ کا ڈھیر بن گیا۔ اور جس قوم نے اسے اپنے سینے میں جگہ دی وہ بھی مردہ ہوگئی۔

اس کے بعد حضرت علامہ مسلمان سے کہتے ہیں کہ — پس چہ باید کرد؟ ان حالات میں تمہیں کیا کرنا چاہیئے۔ تمہاری بازآفرینی کی شکل کیا ہے؟ اس مرض کا علاج کیا ہے؟ فرماتے ہیں کہ

اے میانِ کیسہ ات نقدِ سخن
بر عیارِ زندگی اورا بزن

بات بالکل صاف، سادہ اور واضح ہے۔ جو کچھ سرمایۂ سخن تیرے پاس ہے۔ تجھے جو کچھ اسلاف سے ورثہ میں ملا ہے۔ وہ

نثر میں ہے یا نظم میں ـــــ اس لئے کہ شاعری صرف نظم میں ہی نہیں ہوتی۔ نثر میں بھی ہوتی ہے۔ جہاں انسان حقائق سے الگ ہو کر لطائف میں کھو گیا۔ سمجھ لیجئے کہ اس نے شاعری شروع کر دی۔ اس لئے جو کچھ بھی تمہیں اسلاف سے ملا ہے، اسے سامنے لاؤ اور زندگی کی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھو۔ اگر وہ اس معیار پر پورا اترتا ہے تو زرِ خالص ہے۔ اگر پورا نہیں اترتا تو کھوٹا سکہ ہے۔ اسے اٹھائے اٹھائے پھرنے سے کیا حاصل؟ موجودہ "سرمایہ" چونکہ مقدار میں بہت بڑا اور وزن میں بہت بھاری ہے۔ اس لئے قوم اس فریب میں مبتلا ہے کہ ہم بڑی متاعِ گراں بہا کے وارث ہیں۔ اس فریب سے نکلنے کا طریق یہ ہے کہ اس "متاعِ گراں بہا" کو کسوٹی پر کس کر دیکھو۔ تمہیں نظر آ جائے گا۔ کہ اس میں بیشتر حصہ تانبے کا ہے۔ جسے تم سونا سمجھ کر سنبھال سنبھال کر رکھ رہے ہو۔ خالص سونا بہت کم ہے۔ لہٰذا اس نظرِ فریب تانبے کو الگ کرو اور صرف زرِ خالص کو اپنے پاس رکھو تاکہ معلوم ہو سکے کہ تمہارے پاس وہ متاع اور وہ جنس کس قدر ہے۔ جس کی بازارِ حیات میں کچھ قیمت ہے۔

حضرت علامہ نے یہاں "عیارِ زندگی" کہہ کر حقائق کے سمندر کو ایک گہر تابدار میں محدود کر دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پیامِ اقبال کی بلندی، گہرائی اور گیرائی کا راز ہی ان کے اعجاز بیں ہے۔ وہ بڑی سے بڑی حقیقت کے اظہار کے لئے ایسا لفظ منتخب کرتے ہیں جسے جوں جوں کھولتے جائیے۔ زمانے کے طرۂ پرپیچ و خم کی طرح اس کی وسعتیں حدود فراموش ہوتی چلی جاتی ہیں قرآن نے اپنے پیام کے متعلق کہا ہے کہ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِیْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا یُحْیِیْكُمْ (۸/۲۴) اے ایمان والو! اللہ اور رسول کی آواز پر لبیک کہو۔ جب وہ تمہیں اس چیز کی طرف دعوت دے جو تمہیں زندگی عطا کرتی ہے۔ یعنی قرآن کا پیغام حیات بخش ہے۔ یہ قوموں کو زندگی عطا کرتا ہے۔ یہ "عیارِ زندگی" پر پورا اترتا ہے۔ اسی کو اقبال نے ان الفاظ میں پیش کیا ہے کہ

اے میانِ کیسہ ات نقدِ سخن
بر عیارِ زندگی اورا بزن

جو کچھ تمہارے ہاں متوارث چلا آ رہا ہے، اسے قرآن کی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھو۔ اگر وہ اس پر پورا اترا۔ تو تم دیکھو گے کہ وہ زندگی کے تقاضوں کا ساتھ دیتا چلا جائے گا۔ یعنی عیارِ زندگی اور عیارِ قرآن ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں۔ جو قرآن کی محک پر پورا اترتا ہے۔ وہ زندگی کے معیار پر بھی پورا اترتا ہے۔ اور جو زندگی کے تقاضوں کا ساتھ دیتا ہے اسے تم قرآن کے مطابق پاؤ گے۔ اسے یاد رکھو کہ عمل کی راہبری ہمیشہ فکر سے ہوتی ہے۔ جس قسم کی کسی قوم کی فکر ہو گی۔ اسی قسم کے اس قوم کے عمل ہوں گے۔ ہمارے وہ اعمال جو ہمیں پستی اور انحطاط کی اس حد تک لے گئے ہیں۔ درحقیقت نتیجہ ہیں اس غلط فکر کا جو ہزار برس سے ہمارے ہاں متوارث چلی آ رہی ہے۔ یہ فکر زندگی کی راہوں کو روشن نہیں کرتی۔ تاریک سے تاریک تر کرتی چلی گئی ہے۔ اور کرتی چلی جائے گی۔ زندگی کے راستے "فکرِ روشن" میں سے جگمگاتے ہیں۔ اسی کو قرآن نے ایمان علی وجہ البصیرت قرار دیا ہے۔ اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت علامہ فرماتے ہیں کہ۔

فکر روشن بیں عمل را رہبر است
چوں درخشد برق پیش از تندر است

جس طرح پہلے بجلی کی چمک پیدا ہوتی ہے۔ اور اس کے بعد اس کی گرج کی آواز آتی ہے۔ اسی طرح عمل کی گرج اور کڑک سے پہلے فکر صحیح (ایمان) کی چمک نہایت ضروری ہے۔ اس کی ضرورت زندگی کے ہر شعبے میں ہے۔ ادب میں اس کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ کیونکہ ادب کا اثر قوموں کی حیاتِ اجتماعیہ پر بڑا گہرا ہوتا ہے۔

فکرِ صالح در ادب می بایدت
رجعتے سوئے عرب می بایدت

ادب میں فکر صالح کی ضرورت لاینفک ہے۔ "فکر صالح" سے مطلب یہ ہے کہ ہم اپنے تصورات و نظریات کو عجم کے غیر اسلامی تاثرات سے یکسر پاک اور صاف کر کے فکر اسلامی کے اولین اور واحد سرچشمہ (قرآن) کی طرف رجوع کریں۔ اس کے علاوہ فکر صالح کہیں اور سے نہیں ملے گا۔

دل بہ سلمائے عرب باید سپرد
تا دمد صبح حجاز از شام کرد

ان معشوقانِ عجمی سے دل ہٹا کر پھر سے سلمائے یثرب کی طرف رجوع کیا جائے۔ اور اس طرح شام عجم سے صبح حجاز کی نمود ہو جائے۔ دوسرے مصرعہ میں شیخ حسام الحق ضیاء الدینؒ کے اس مقولہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اَمْسَیْتُ کُرْدِیًّا وَاَصْبَحْتُ عَرَبِیًّا۔ یعنی میں گذشتہ شب تک کرد تھا جب صبح اٹھا تو عرب ہو گیا۔ شیخ ضیاء الحق مولانا روم کے خاص دوستوں میں سے تھے۔ چنانچہ مثنوی رومی میں ان کا تذکرہ کئی جگہ آیا ہے۔ اس کے بعد علامہ اقبال کہتے ہیں۔

از چمن زارِ عجم گل چیدۂ — نوبہارِ ہند و ایراں دیدۂ
اندکے از گرمیٔ صحرا بخور — بادۂ دیرینہ از خرما بخور

تم نے عجم کے باغوں ہی سے گل چینی کی ہے۔ تم نے ہندوستان اور ایران کے گلدستوں کی بہاریں ہی دیکھی ہیں۔ اب ذرا ان سے منہ موڑ کر عرب کے صحرا کی طرف آؤ۔ وہاں کی حرارت افروز فضا سے اپنے سینوں کو گرمجوش کرو۔ عجمی تاکستانوں کی شراب ہوش ربا کو چھوڑو اور "کھجور کے بادۂ صاف و شیریں" سے اپنی گم کردہ ہوشی کی بازیابی کا سامان پیدا کرو۔ یہ ہے کرنے کا کام۔

وہی دیرینہ بیماری، وہی نامحکمی دل کی
علاج اس کا، وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی

اس سے تمہارے سخت لبتہ سینوں میں از سر نو حرارت پیدا ہو گی۔

سریکے اندر بیر گرمش بدہ
تن دمے با صرصر گرمش بدہ

فکرِ عجم کی برفانی سلوں سے تمہارے عروقِ مردہ میں خونِ زندگی جم گیا ہے۔ اس میں حرکت پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ صحرائے عرب کی گرم لوؤں کے تھپیڑے کھلائے جائیں۔ تاکہ تمہارے سینوں میں ولولے بیدار اور بازوؤں میں قوتِ عمل و کردار کی نمود ہو۔

مدتے غلطیدۂ اندر حریر
خوبہ کر پاس درشتے ہم بگیر

ایک عرصۂ دراز تک تو نرم و نازک ریشمی لباس میں ملبوس رہنے کی وجہ سے بڑا نازک مزاج ہو چکا ہے۔ عجمی تکلفات نے تجھ سے سپاہیانہ زندگی بسر کرنے کی صلاحیت سلب کر لی ہے۔ جہاد جو مومن کی زندگی کا مرکزی نقطہ ہے۔ اس کا تصور بھی تیری روح کو کپکپا دینے کے لئے کافی ہے۔ قرآن کی تعلیم یہ تھی کہ تو دنیا کی ہر پرخطر وادی میں مسکراتا ہوا جادہ پیما ہو جائے اور ہر مشکل اور مصیبت کا مردانہ وار مقابلہ کرے۔ کیونکہ مشکلات درحقیقت انسانی خودی کی محکمیت کے پرکھنے کا ذریعہ ہوتی ہیں لیکن مشکلات وہ نہیں جو انسان خود پیدا کرلے۔ یا اس کی ذاتی اغراض کے حصول کی راہ میں آئیں۔ بلکہ وہ مشکلات و موانع جو باطل کی طرف سے حق کی راہ میں حائل ہوں۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی مجاہدانہ زندگی وہی بسر کر سکتا ہے جو سختیاں جھیلنے کا عادی اور مشکلات برداشت کرنے کا خوگر ہو۔ عجمی تصورات نے مسلمان کو اس قسم کی زندگی سے بیگانہ بنا کر اسے پرلے درجے کا اہل انگار اور تن آسان بنا دیا ہے۔ ضرورت اس کی ہے کہ یہ پھر سے سخت و درشت زندگی بسر کرنے کا عادی بنے۔ اور یہ کچھ قرآن کے عطا فرمودہ تصورِ حیات اور اس کے متعین کردہ اسلوبِ زندگی ہی سے ہو سکتا ہے۔

قرنہا بر لالہ پا کوبیدۂ — عارض از شبنم چو گل شوئیدہ
خویش را بر ریگ سوزاں ہم بزن — غوطہ اندر چشمۂ زمزم بزن

تو ایک عرصۂ دراز سے زندگی کو پھولوں کی سیج سمجھتا چلا آ رہا ہے۔ تو اس قسم کی آرام طلبی کی زندگی بسر کرنے کا عادی ہو چکا ہے۔ ان راہوں میں چلنا جن میں پھول بچھے ہوں اور صبح اٹھ کر قطراتِ شبنم سے منہ دھونا۔ عجمی انداز فکر نے تیری زندگی کو یہ کچھ بنا دیا ہے۔ اب تو اس راحت طلبی اور آرام کوشی کی زندگی کو چھوڑ۔ صحرا کی گرم گرم ریت پر سونے کی عادت ڈال اور عجمی قطراتِ شبنم کے بجائے کعبہ کے آبِ زمزم سے چہرے کے گرد و غبار کو دور کرنے کا اسلوب سیکھ۔ یعنی اپنے ادراک کو تمام غیر قرآنی تصورات سے پاک کر کے پھر سے اس مجاہدانہ زندگی کی طرف آجا۔ جسے اسلام نے مومن کا صحیح شعار بتایا ہے۔

مثل بلبل ذوقِ شیون تا کجا
در چمن زاراں نشیمن تا کجا

تو کب تک رونے دھونے میں لگا رہے گا۔ آہ و نالہ اور گریہ و فریاد کی زندگی تا کجا؟ فلک نا ہنجار کے شکوے اور قسمت کے گلے کب تک؛ یہ زندگی مردوں کے شایانِ شان نہیں؛ اسے مومن کا شعار نہیں کہا جا سکتا۔ مومن کی زندگی تو ایک طرف، اس کی آخری لمحات میں بھی یہ حالت ہوتی ہے کہ ـــ چو مرگ آید تبسم بر لب اوست۔ اس لئے تجھے مومن کی زندگی اختیار کرنی چاہیئے۔ تیری یہ حالت اس لئے ہو چکی ہے کہ تو نے اپنی ساری زندگی زریب رنگ و بو کے گلستانوں میں بسر کی ہے! اس چمن سے اپنا آشیانہ اٹھا ـــ تو شاہین ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں۔

اے ہما از یمنِ دامت ارجمند　　آشیانے ساز بر کوہِ بلند
آشیانے برق و تندر در برے　　از کنامِ جرہ بازاں برترے

اتنے عرصہ کی غیر قرآنی زندگی سے تیرا مقام ہی درحقیقت تیری نظروں سے اوجھل ہو چکا ہے۔ تیرا مقام وہ تھا کہ اگر ہما جس کا سایہ لوگوں کو بادشاہ بنا دیتا ہے، تیرے دام میں پھنس کر تیرا شکار ہو جاتا تو وہ اسے اپنے لئے وجہ صد ہزار سعادت اور باعث صد ہزار افتخار سمجھتا۔ ہما بلند ترین فضاؤں میں اڑتا ہے۔ تیرا مقام اس سے کہیں زیادہ بلند تھا۔ یہ زندگی تیرے لئے باعث ننگ و عار تھی کہ تو درخت کی سب سے نچلی شاخوں پر آشیانہ بناتا اور پھر وہاں سے بھی گر کر با صد آہ و زاری پکارتا کہ

صبا شکستہ پروں کی دعائیں لیتی جا
جھکا دے اور ذرا شاخ آشیانے کی

تیرا مقام یہ ہے کہ تو پہاڑ کی بلند ترین چٹانوں پر آشیانہ بنائے۔ اور آشیانہ بھی وہ نہیں جسے بجلی کی ایک جھپک جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دے۔ وہ آشیانہ جو سینکڑوں بجلیاں اور ہزاروں رعد آسا بلائیں اپنے آغوش میں لئے ہو۔ ایسا آشیانہ جو شاہین و عقاب کی قیام گاہوں سے بھی بلند ہو۔ ایسا بلند کہ وہاں سے انسان اپنے مقدرات کے ستارے بھی جھک کر دیکھے؛ ایسا آشیانہ بنا

تا شوی در خوردِ پیکارِ حیات
جسم و جانت سوزد از نارِ حیات

تاکہ تو کشمکشِ حیات کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو سکے۔ تیری خودی اس قدر مستحکم ہو جائے کہ تو موت سے بھی نہ مر سکے؛ تیرا جسم و جان نارِ حیات میں جلنے کے بعد کندن بن کر نکلے۔ انسان کے لئے ایک نئی زندگی، ایک پائندہ و تابندہ زندگی حاصل کرنے کا یہی طریق ہے۔

ہو صداقت کے لئے جس دل میں مرنے کی تڑپ
پہلے اپنے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرے
پھونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار
اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے

لیکن یہ حیاتِ تازہ۔ یہ نشاۃ ثانیہ۔ یہ بازآفرینی۔ قرآن کے آبِ حیات کے علاوہ اور کسی سرچشمہ سے نہیں مل سکتی۔

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن

یہ تھے علامہ اقبال کے انقلابی تصورات ہماری شاعری کے خلاف۔ لیکن کس قدر ستم ظریفی ہے کہ ہنوز اقبال کا کفن بھی میلا نہیں ہونے پایا کہ ہم نے اسے پھر سے انہی شاعروں کی صف میں لاکھڑا کیا۔ جنہیں وہ موت کے پیامبر اور قبرستانوں کے مجاور قرار دیتا تھا۔ اب ہمارے ہاں اقبال کا مصرف صرف اس قدر رہ گیا ہے کہ جب ہمارے ریڈیو کا کوئی پروگرام وقت سے پہلے ختم ہو جائے تو اس کے چند اشعار دہرا دیئے جائیں۔ یا جمعرات (پیروں فقیروں کے دن) طبلے کی دھماپ نہیں بلکہ (دھائیں دھائیں) سے قوالوں کے فلک شگاف گلے سے اس کے پیغام کو جہنم گوش بنایا جائے۔ یعنی اسے اس قوالی کا موضوع بنایا جائے، جسے اقبال نے خود افیون قرار دیا تھا۔

اف۔ کس قدر گہری اور تیز تھی طنز اس مرد دیدہ ور کی جس نے قوم کی حالت کا اندازہ لگا کر اپنے متعلق کہا تھا

کہ اگ مردتن آساں تھا تن آسانوں کے کام آیا:

اقبال اور قرآن

اقبال نے قرآنی انقلاب کی آواز سے فضا کو معمور کیا
قرآن کیا کہتا ہے اور اقبال کا پیغام کیا ہے
ان کے جوابات مفسرِ قرآن اور ترجمان اقبال پرویز سے سنئے۔

ضخامت ۲۵۶ صفحات قیمت دو روپے

ناظم ادارہ طلوع اسلام ۱۵۹/۳۔ ایل۔ پی۔ ای۔ سی۔ ایچ سوسائٹی کراچی

باب المراسلات

۱۔ تراویح

لکھنؤ (بھارت) سے ایک صاحب لکھتے ہیں۔

"احناف کہتے ہیں کہ رمضان میں روزانہ بیس تراویح سنت موکدہ ہیں۔ اور اہل حدیث وشیعہ اس کے قائل نہیں۔ اہل حدیث کے نزدیک تراویح اور تہجد ایک ہیں۔ اور ان کی تعداد آٹھ رکعات ہیں۔ وہ بیس تراویح کو بدعت کہتے ہیں۔ اس مسئلہ پر احناف اور اہل حدیث میں لڑائیاں بھی ہوئی ہیں۔ اور ہوتی ہیں۔ آپ کی تحقیق تراویح کے بارے میں کیا ہے؟ ..... احناف اس امر کا اعتراف کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ سے قبل تراویح کا دستور نہیں تھا لیکن اس کے باوجود تراویح کے تارک کو گنہگار بتاتے ہیں۔ اس کی اصلیت کیا ہے؟

طلوع اسلام تراویح کا ذکر قرآن کریم میں نہیں ہے۔ آیا ان کی ابتداء رسول اللہ کے زمانہ سے ہوئی تھی یا حضرت عمرؓ کے زمانہ یہ تاریخ کا سوال ہے۔ اور اس باب میں اہل تشیع اور اہل تسنن حضرات کا اختلاف اور ان کی بحثیں سب کو معلوم ہیں۔ پھر یہ سوال کہ آیا ان کی رکعتوں کی تعداد آٹھ ہے یا بیس، خود اہل تسنن کے ہاں اختلافی ہے۔ اور ان کی بحثیں بھی کسی سے پوشیدہ نہیں طلوع اسلام ان بحثوں میں نہیں الجھا کرتا۔ جن امور کا ذکر قرآن میں نہیں۔ ان کے متعلق اس کا مسلک واضح ہے۔

اسلام، قرآنی حدود کے اندر ضبط خویش کی زندگی کا نام ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ انسان (مسلمان) کو معلوم ہو کہ قرآنی حدود کیا ہیں۔ اور اس کے ساتھ ہی وہ ضبطِ نفس کا خوگر ہو۔ رمضان کا مہینہ ان ہر دو امور کے پیدا اور مستحکم کرنے کا ایک خصوصی ذریعہ ہے۔ دورِ حاضر کی اصطلاح میں اسے ٹریننگ کیمپ یا (REFRESHER COURSE) کہیئے۔ روزہ انسان کو ضبط خویش سے مجاہدانہ زندگی کا خوگر بناتا ہے۔ اور اس کے لئے اس مہینے کا تعین جس میں نزولِ قرآن کی ابتدا ہوئی تھی۔ اس حقیقت کو سامنے لاتا ہے کہ اس ٹریننگ کے کورس میں اس کا خاص انتظام ہونا چاہیئے کہ مجاہدین کے سامنے پورا قرآن آجائے۔ تاکہ وہ اچھی طرح سمجھ لیں کہ دنیا میں تلوار اور قرآن کا رشتہ کیا ہے۔ اور یہ کس طرح ایک دوسرے کے محافظ بنتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ دورِ اول کے اسلامی نظام نے قرآن کو بیک وقت ذہنوں میں مستحضر کرنے کے لئے یہ طریقہ تجویز کیا تھا جسے اب محض "حصولِ ثواب" کے لئے ادا کر دیا جاتا ہے۔ اس لئے کہ جس طرح سے اب تراویح میں قرآن دہرایا جاتا ہے۔ اسے نہ سننے والا حافظ سمجھتا ہے کہ میں کیا پڑھ

رہا ہوں۔ اور نہ سننے والے متقدی سمجھتے ہیں کہ ہم کیا سن رہے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ جس قرآن کے الفاظ صرف دہرائے یا سنے جائیں۔ اور انھیں سمجھا نہ جائے۔ اس سے قرآن کا مفہوم سامنے نہیں آ سکتا۔ اور نہ ہی یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ ہمارے لئے زندگی کا کون سا نقشہ متعین کرتا ہے۔ جب خلافت علیٰ منہاج نبوت قائم ہوگی۔ تو یہ دیکھنا اس کا کام ہوگا کہ ہمارے ان مروجہ طریقوں میں کہاں کہاں اصلاح کی ضرورت ہے۔ "گناہ اور ثواب" کا صحیح مفہوم بھی اسی وقت سامنے آئے گا۔

---

(۲) قرآن و حدیث ہمارے ہاں کے نیم مذہبی مفاد پرستوں نے حدیث کے بارے میں ایسا خلط مبحث کر دیا ہے کہ اس سے عوام کے ذہن میں (جن میں مساجد کے ائمہ بھی شامل ہیں) عجیب عجیب الجھاؤ پیدا ہو رہے ہیں۔ مثلاً ہمارے ہاں اکثر اس قسم کے استفسارات آتے رہتے ہیں کہ اگر ہم حدیث کو نہ مانیں تو اس کا کیا ثبوت ہے کہ موجودہ قرآن رسول اللہ پر خدا کی طرف سے نازل ہوا تھا۔ ان استفسارات کو دیکھ کر ہمیں رہ رہ کر افسوس ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے محض اپنے ذرا سے مفاد (خواہ قلیل) کی خاطر عوام کے دلوں کو کس کس قسم کے شکوک کی آماجگاہ بنا دیا ہے۔ سب سے پہلے تو یہ کہ ان مستفسرین کو اس کا بھی علم نہیں کہ حدیث کو ماننے اور نہ ماننے کا مطلب کیا ہے؟ "فلاں شخص یا گروہ حدیث کو نہیں مانتا" یہ ایک فقرہ ہے جسے آجکل عام طور پر دہرا دیا جاتا ہے۔ بغیر اس بات کے سوچنے کے کہ اس کے معنی کیا ہیں؟ اعتراض کی صحیح شکل یہ ہونی چاہیئے کہ فلاں شخص یا گروہ حدیث کے متعلق یہ عقیدہ یا مسلک رکھتا ہے۔ جو یوں غلط ہے۔ اس طرح استفسار زیر نظر کی صحیح شکل بھی یہ ہونی چاہیئے کہ فلاں شخص حدیث کے متعلق یہ عقیدہ رکھتا ہے۔ اگر اس عقیدے کو صحیح مان لیا جائے۔ تو پھر اس کا کیا ثبوت دیا جائے گا کہ موجودہ قرآن رسول اللہ پر خدا کی طرف سے نازل ہوا تھا۔

اب آیئے اصل اعتراض کی طرف۔ ان اعتراض کرنیوالوں کے دل میں یہ بات بٹھا دی گئی ہے کہ اگر حدیثوں کے متعلق یہ کہا جائے کہ ہم یقینی طور پر نہیں کہہ سکتے کہ وہ رسول اللہ کی ہیں تو پھر یہ کیسے سمجھا جائے گا کہ رسول اللہ پر قرآن خدا کی طرف سے نازل ہوا تھا اور موجودہ قرآن وہی ہے جو رسول اللہ پر نازل ہوا تھا۔ یہ باتیں تو احادیث ہی سے ملتی ہیں۔

یہ کہنا غلط ہے کہ یہ باتیں صرف احادیث کے اندر ملتی ہیں۔ یہ باتیں خود قرآن کے اندر موجود ہیں کہ:

(۱) قرآن اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا..... اَلْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ ..... تَنْزِيْلَ الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ (۳۶/۲)

(۲) قرآن محمدؐ پر نازل ہوا تھا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّهُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ (۴۷/۲)

(۳) قرآن کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے رکھا ہے۔ اس لئے اس میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (۱۵/۹) اس لئے ہمارا موجودہ قرآن حرفاً حرفاً وہی ہے۔ جسے خدا نے محمدؐ پر نازل کیا تھا۔

اس سے صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ ان امور کی داخلی شہادات خود قرآن کے اندر موجود ہیں۔

اب رہا یہ سوال کہ ہم یہ کس طرح ثابت کر سکتے ہیں کہ قرآن خدا کا کلام ہے۔ ہمیں رسول اللہ نے بتایا کہ یہ خدا کا کلام ہے۔ تو ہم

نے ایسا مان لیا۔ اس لئے ہم ایسا ماننے کے لئے حدیث کے محتاج ہیں۔

آپ ذرا سوچئے کہ اس اعتراض (یا دلیل) کے معنی کیا ہیں۔ یعنی چونکہ فلاں حدیث میں یہ آیا ہے کہ قرآن خدا کا کلام ہے۔ اس لئے ہم اسے ایسا مانتے ہیں۔ اگر اس میں ایسا نہ لکھا ہوتا تو ہمارے پاس اس کا کوئی ثبوت ہی نہ تھا کہ قرآن خدا کا کلام ہے۔

پہلے تو یہ دیکھئے کہ جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں۔ یہ بات خود قرآن کے اندر موجود ہے کہ قرآن منزل من اللہ ہے۔ اب آگے بڑھیے جہاں تک ایک مسلمان کا تعلق ہے۔ اس کے لئے اس کی ضرورت ہی نہیں کہ وہ اس کا ثبوت تلاش کرے کہ قرآن خدا کا کلام ہے۔ اس کا ایمان ہے کہ قرآن خدا کا کلام ہے اور محمدؐ اس کے سچے رسول ہیں۔ اگر اسے اس میں ذرا سا بھی شبہ ہے تو وہ مسلمان نہیں کہلا سکتا۔ وہ غیر مسلموں کے زمرے میں شامل ہو جائے گا۔

اب رہے غیر مسلم۔ ان کے متعلق سوچئے کہ اگر کوئی غیر مسلم آپ سے کہے کہ ثابت کیجئے کہ قرآن خدا کا کلام ہے تو کیا آپ اسے یہ کہینگے کہ چونکہ فلاں حدیث میں آیا ہے کہ قرآن خدا کا کلام ہے۔ اس لئے اس سے ثابت ہو گیا کہ یہ خدا کا کلام ہے! کیا ایک غیر مسلم کے لئے یہ دلیل کافی ہو جائے گی؟ حدیث تو ایک طرف، اس سے تو اگر آپ یہ بھی کہیں کہ خود قرآن کے اندر لکھا ہے کہ یہ خدا کا کلام ہے۔ تو اس کے نزدیک یہ بھی اس دعوے کے اثبات کی دلیل نہیں ہوگی۔ اس کے لئے دلیل وہی ہے جسے قرآن نے بطور دلیل پیش کیا ہے قرآن نے کہا ہے کہ اگر ان لوگوں کو اس بات میں شبہ ہے کہ یہ خدا کلام ہے تو ان سے کہو کہ اس قرآن کی کسی ایک سورۃ کے مثل بنا کر دکھاؤ۔ یہ ایسا نہیں کر سکیں گے۔ یعنی ان میں سے جو لوگ صاحبانِ علم و بصیرت ہوں گے۔ اور وہ تعصب سے خالی ہو کر قرآن پر غور کریں گے تو وہ خود اس نتیجے پر پہونچ جائیں گے کہ یہ فی الواقعہ کسی انسان کا کلام نہیں۔ جیسا کہ قرآن نے اس زمانے کے اہل کتاب کے متعلق کہا ہے کہ یَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ (۲/۱۴۶) وہ قرآن کو اس طرح پہچانتے ہیں۔ جس طرح وہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں) لیکن جو لوگ از خود اس طرح قرآن پر غور کرنا نہ چاہیں۔ ان کے لئے مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ ثابت کریں کہ ان کی کوششیں آج تک کوئی ایسا نظام زندگی وضع نہیں کر سکیں۔ جو قرآن کے کسی ایک شعبے کا بھی جواب ہو۔ اس بات کو دلائل و بصیرت اور علم و برہان کی رو سے ثابت کرنا ہوگا۔ یہی ایک غیر مسلم کے لئے اس امر کی دلیل ہوگی کہ قرآن انسان کا کلام نہیں خدا کا کلام ہے۔

قریب چار برس ہوئے ہم نے پاکستان بھر کے علمائے کرام کی خدمت میں گذارش کی تھی کہ وہ اس موضوع پر تفصیل سے لکھیں کہ اسلام کی تعلیم کس طرح بے مثل و بے نظیر اور انسانی ذہن اس کی مثال کیوں پیش نہیں کر سکتا۔ ان تفصیلی مضامین کو ہم طلوع اسلام میں شائع کریں گے۔ آپ حیران ہوں گے کہ ان میں سے کسی ایک نے اس موضوع پر ایک سطر بھی لکھ کر نہیں بھیجی۔ نہ ہی ہمیں بھیجی، اور نہ ہی (جہاں تک ہمیں معلوم ہے) اپنے ہاں کسی جگہ شائع کی۔ لیکن چار برس مسلسل طلوع اسلام کو گالیاں دینے میں صرف کر دیئے۔ اس میں بھی اگر کسی نے کچھ کیا، تو اسی نے جسے یہ علماء حضرات (معاذ اللہ) "اسلام کا بدترین دشمن" قرار دے رہے ہیں۔ "انسان نے کیا سوچا؟" اس سلسلہ کی پہلی کڑی ہے اس کے بعد جب اس کی دوسری جلد "خدا نے کیا کہا؟" شائع ہو جائے گی۔ تو یہ کتاب ہر غیر مسلم کے لئے مسلمانوں کے اس دعوے کی دلیل

ہوگی کہ قرآن فی الواقعہ خدا کا کلام ہے۔ ذہن انسانی اس کی مثل لا نہیں سکتا۔ دوسری صورت اس کی یہ ہے کہ قرآن کا بتایا ہوا نظام عملاً متشکل کر دیا جائے۔ اس کے نتائج دنیا کو خود بتا دیں گے کہ یہ ضابطۂ حیات فی الواقع بے مثل و بے نظیر ہے۔ طلوع اسلام اس قسم کے نظام کی تشکیل کے لئے بھی برابر دعوت دے رہا ہے۔ رسول نے قرآن کو اسی طریق سے اپنے مخاطبین کے سامنے پیش کیا تھا۔ اور ان سے منوایا تھا کہ وہ فی الواقعہ خدا کا کلام ہے۔ اور اسی طریقہ سے حضورؐ کی سنت کے پیرو اسے دنیا کے سامنے پیش کریں گے۔ اور مولوی اس طریق پر قرآن پیش کرنے والوں کو "منکرین سنت" قرار دیتا چلا جائے گا۔ اس لئے کہ اسے خود اس کی توفیق نہیں کہ وہ قرآن کو دنیا کے سامنے اس طرح پیش کر سکے۔ اس کے لئے علم کی ضرورت ہوتی ہے۔

آخر میں ہم ان حضرات سے جو دین سے دلچسپی رکھتے ہیں، ایک مرتبہ پھر گذارش کریں گے کہ وہ یہ کہنے سے پہلے کہ "طلوع اسلام" حدیث کو نہیں مانتا، خود طلوع اسلام سے پوچھ لیا کریں کہ حدیث کے متعلق اس کا مسلک کیا ہے۔ یہ مسلک ایک چھوٹے سے پمفلٹ میں درج ہے۔ جس کا عنوان ہے۔ "سنت رسول اللہ" اسے پڑھ لینے سے آپ بہت سی بے معنی الجھنوں سے بچ جائیں گے۔

۳۔ فسخ نکاح

حیدرآباد (دکن) سے ایک محترم خاتون لکھتی ہیں۔

"طلوع اسلام" میں عائلی قوانین کے سوالنامے اور آپ کے بصیرت افروز جواب نظر سے گذرے آپ ہمیشہ ہی مظلوم بہنوں اور بیٹیوں کے حقوق کے لئے لڑتے آئے ہیں۔ مگر پھر بھی قرآن اور اس کے قوانین کو پس پشت ڈال کر ایسے مسائل میں سماج کو ہمیشہ سامنے رکھا جاتا ہے۔

نکاح کی تو بنیاد ہی باہمی موافقت پر ہے۔ مگر باوجود اختلاف مزاج اور انتہائی تلخ اور ناخوشگوار ازدواجی زندگی کے مجھے فسخ نکاح کی اجازت نہیں دی جاتی۔ ہمیشہ سماج اور اخلاق کا ناجائز دباؤ ڈال کر بجبر و اکراہ زندگی گذارنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ کیا آپ اس باب میں مفصل نہیں لکھ سکتے کہ سماج کیا ہے اور اس کا یہ بے جا دباؤ کہاں تک جائز ہے؟ نہ جانے کتنی مظلوم بہنیں بے جا شرم و حیا کو توڑ کر کسی جرأت مندانہ اقدام سے مجبور ہیں اور اپنی زندگی گھٹ گھٹ کر گذار رہی ہیں بلند آپ اس جھوٹے سماج اور اس کی پابندیوں کے خلاف کچھ لکھئے۔ تاکہ ہم میں ہمت اور جرأت پیدا ہو۔

طلوع اسلام طلوع اسلام کی تو زندگی کا فریضہ یہ ہے کہ ہمارے سماج میں جس قدر غیر قرآنی باتیں آ چکی ہیں۔ ان کے خلاف آواز بلند کرے۔ وہ اپنے اس فریضہ کی ادائیگی میں مسلسل و پیہم مصروف سعی و عمل ہے۔ لیکن اس قسم کی باتیں صرف لکھنے سے دور نہیں ہوا کرتیں۔ یہ دور ہوتی ہیں حکومت کے قوانین سے۔ ہندوستان کی حکومت کے متعلق ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ پاکستان کی مملکت کے لئے ایک موقع آیا تھا کہ وہ اپنے آئین کی بنیاد قرآن پر رکھ لیتی۔ تاکہ اس کے تابع جس قدر قوانین بنتے۔ وہ ہمارے سماج کی ان زنجیروں کو توڑ ڈالتے جن میں انسانیت صدیوں سے جکڑی چلی آ رہی ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ دستور سازی کے مرحلۂ اول میں

میں یہ کام نہیں ہو سکا۔ اس میں قرآن پر ملّا غالب آ گیا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مظلوم انسانیت (وہ مرد ہوں یا عورتیں) بدستور انسانوں کے خود ساختہ قوانین کی زنجیروں میں جکڑی رہے گی۔ لیکن طلوع اسلام بدستور اپنی کوششوں میں مصروف ہے کہ اگر آئین سازی کے پہلے مرحلہ میں ایسا نہیں ہو سکا تو اس کے بعد کسی اور مرحلے میں ایسا ہو جائے۔ یاد رکھیئے نوع انسانی صرف اس دن صحیح آزادی کا سانس لے سکے گی۔ جب اس پر خدا کے قانون کے علاوہ کسی اور کا قانون مسلط نہ ہوگا۔ لا الٰہ الا اللہ کا یہی عملی مفہوم ہے

۴۔ جھنڈے کی سلامی

جلالپور جٹاں سے ایک صاحب لکھتے ہیں۔

"آج یہاں مختلف مکاتیب فکر سے تعلق رکھنے والے اصحاب جشن جمہوریہ کا پروگرام مرتب کرنے کے لئے ٹاؤن ہال میں اکٹھے ہوئے۔ اس اجتماعِ ضدین میں جو جو موشگافیاں ہوئیں۔ انھیں بیان کرنا تضیع اوقات ہے۔ لیکن اس سلسلہ میں ایک بات اتنی اہم ہے جسے سنکر میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ مجلس میں جب قومی جھنڈے کی سلامی کی تجویز پیش ہوئی، تو جماعت اسلامی کے نمائندوں نے اعتراض کیا کہ جھنڈے کو سلامی دینا کفر اور بت پرستی میں شامل ہے میں ایک سابق فوجی ہوں۔ اس لئے میرے دل میں جو قومی جھنڈے کی عزت و احترام ہوگا۔ اسے آپ بخوبی جانتے ہونگے اس "اسلامی انکشاف" پر مجھے بہت حیرانگی اور سخت صدمہ پہنچا۔ پاکستان کے لاکھوں سپاہی (جو عموماً سادہ مسلمان ہوتے ہیں) اگر قومی پرچم کی سلامی کو کفر سمجھ لیں۔ تو پھر اس کے نتائج بڑے خطرناک اور تباہ کن ہو سکتے ہیں۔ جس سے ملک کی سلامتی اور بقا کو نقصان پہنچ سکتا ہے کیا ادارہ طلوع اسلام یا جناب پرویز طلوع اسلام کے آئندہ شمارے میں اس پر روشنی ڈالیں گے"؟

طلوع اسلام جھنڈا یا پرچم کسی مملکت یا نظام کی محسوس نشانی یا علامت (SYMBOL) ہوتا ہے۔ اسے عربی زبان میں شعار کہتے ہیں۔ جب کوئی شخص جھنڈے کی تعظیم کرتا ہے۔ تو وہ اس ڈنڈے یا اس کے اوپر لہرانے والے کپڑے کی تعظیم نہیں کرتا جس سے وہ جھنڈا ترتیب پاتا ہے۔ وہ درحقیقت اس مملکت یا نظام کی تعظیم کرتا ہے۔ جس کی علامت وہ جھنڈا ہوتا ہے۔ پاکستانی جھنڈے کی تعظیم کے معنی ہوں گے "اسلامی جمہوریہ پاکستان" کی تعظیم۔

قرآن نے شعائر اللہ کی تعظیم کا حکم دیا ہے۔ اور اسے "دلوں کے تقوے" سے تعبیر کیا ہے وَمَنْ يُعَظِّمْ شَعَائِرَ اللّٰهِ فَإِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوبِ (۲۲/۳۲) اور ان کی بیحرمتی سے بڑی شدت سے روکا ہے يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُحِلُّوا شَعَائِرَ اللّٰهِ (۵) قرآن نے خانہ کعبہ اور حج سے متعلق مختلف چیزوں کو شعائر اللہ کہہ کر پکارا ہے۔ صفا مروہ کی پہاڑیاں اور وہ جانور جنھیں حج کے موقع پر مکہ میں ذبح کیا جائے۔ "شعائر اللہ" قرار دیئے گئے ہیں۔ خانہ کعبہ دنیا میں اس نظام کا مرکز ہے جس کی بنیاد خدا کی توحید (یعنی ایک خدا کے قانون کی اطاعت) پر ہے۔ اور حج اس نظام کے نمائندگان کا اجتماع

ہے۔ لہٰذا یہ تمام چیزیں جنہیں "شعائر اللہ" کہا گیا ہے۔ اس مملکت یا نظام کی نمائندہ علامت ہیں۔ جو خدا کی توحید کا علم بلند کرنے کے لئے قائم کی جائے۔

حصولِ پاکستان کی تحریک اور مملکت پاکستان کا قیام اس منشاء اور دعوے کی رو سے ظہور پذیر ہوا کہ مسلمانوں کو ایک ایسا خطۂ زمین چاہیئے۔ جس میں وہ اسلامی تصورات کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔ اب اس مملکت نے اپنے آئین میں شروع میں کہہ دیا ہے کہ ہمارا نصب العین یہ ہے کہ ہم حدود اللہ کے اندر رہتے ہوئے اپنے اختیارات استعمال کریں۔ جس مملکت کے سامنے نصب العین یہ ہو (یہ الگ بات ہے کہ اس نصب العین تک پہنچنے کے لئے وہ کن مختلف مراحل سے گذرتی ہے) اس مملکت کے پرچم کی تعظیم اسی طرح شعائر اللہ کی تعظیم میں داخل ہوگی جس طرح اس خطۂ زمین کا تحفظ مسلمانوں کا دینی فریضہ ہوگا۔ پاکستان میں رہتے ہوئے جو لوگ اس پرچم کا احترام نہیں کرتے۔ ان کے دل میں اس مملکت اور نظام کا احترام نہیں جس کی یہ پرچم نمائندگی کرتا ہے۔ اسی کو بغاوت کہتے ہیں۔ پرچم کی تعظیم بت پرستی نہیں ہوتی۔ بت پرستی میں بت کو یا تو خود خدا سمجھا جاتا ہے۔ یا خدا کا مظہر۔ اس لئے اس کی پرستش شرک ہے۔ پرچم کو نہ خدا سمجھا جاتا ہے۔ نہ خدا کا مظہر۔ اور نہ ہی اس کی پرستش کی جاتی ہے اس کی فقط تعظیم کی جاتی ہے۔ البتہ اس تعظیم کے اظہار کے لئے کوئی ایسا طریقہ اختیار نہیں کرنا چاہیئے۔ جو خدا کے لئے مخصوص ہو۔ مثلاً سجدہ کرنا۔

"جوئے نور"

سلسلۂ معارف القرآن کی دوسری کڑی

جو حضرات انبیائے کرام کے تذکار جلیلہ پر مشتمل ہے۔ جس میں حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر حضرت شعیب علیہ السلام تک تمام انبیائے کرام کا تذکرہ آ گیا ہے۔ یہ کتاب محترم مصنف کی نظرثانی کے بعد دوسری مرتبہ شائع کی گئی ہے۔

۳۰۴ صفحات۔ قیمت مجلد مع گرد پوش چھ روپے (علاوہ محصول ڈاک)

ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام۔ ۱۵۹/۱ بلاک نمبر ۳۔ پی۔ ای۔ سی۔ ایچ سوسائٹی۔ کراچی

نقد و نظر

انسان نے کیا سوچا؟

محترم پرویز صاحب کی عظیم کتاب "انسان نے کیا سوچا؟" پر جریدہ ٹائمز آف کراچی میں حسب ذیل تبصرہ شائع ہوا ہے۔ اصل تبصرہ انگریزی زبان میں ہے۔ جس کا رواں ترجمہ پیش ناظرین ہے

یہ سوال کہ اسلام کسی سیاسی نظام کی بنیاد بن سکتا ہے یا نہیں۔ ایک عرصے سے معرضِ بحث میں چلا آرہا تھا۔ تا آنکہ موجودہ صدی کے ربع اول کے آخر میں، ترکوں نے الغائے خلافت سے اس کا جواب نفی میں دیدیا۔ اس وقت ہمارے سامنے یہ سوال نہیں کہ اس تجربے نے جو دنیائے اسلام میں پہلا تجربہ تھا۔ کیا نتائج پیدا کئے۔ اس وقت ہم صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ترکوں کے اس فیصلہ سے عام طور پر سمجھا یہ گیا کہ لادینیت (SECULARISM) نے اسلامیت پر غلبہ پالیا ہے۔

لیکن ترکوں کے اس فیصلہ نے اس اہم سوال کا آخری فیصلہ نہیں کردیا۔ ان کے فیصلے کے سات سال بعد علامہ اقبال نے اپنے مشہور خطبہ میں یہ مطالبہ پیش کیا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کو ایک جداگانہ خطۂ زمین ملنا ضروری ہے۔ تاکہ وہ اس میں اسلامی انداز کی مملکت قائم کرکے۔ اپنی زندگی کی تشکیل اپنے نصب العین کے مطابق کرسکیں۔ اسلامیانِ ہند نے اس مطالبہ سے اس سوال کا جواب اثبات میں دیا۔ یعنی انھوں نے کہا کہ اسلام ایک سیاسی نظام کی بنیاد بن سکتا ہے۔

مسلمانانِ ہند (یعنی پاکستانی مسلمانوں) نے اپنے لئے جو یہ راستہ منتخب کیا۔ تو اس کی عقلی توجیہہ کیا تھی؟ یعنی انھوں نے کس دلیل کی بنا پر کہدیا کہ مسلمانوں کی مملکت لادینی نہیں ہوسکتی۔ اس کا مدار اسلام پر ہونا چاہیئے۔ زمانہ کی طرف سے یہ چیلنج تھا کہ تم ثابت کرو کہ وہ نظام جو انسانیت کو اس کی منزلِ مقصود تک لے جائے۔ خالص عقل کی بنیادوں پر قائم نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے لئے وحی کی بھی ضرورت ہے۔ یہ چیلنج ابھی تک شرمندۂ جواب نہ ہوا تھا۔ اب اس کا جواب قرآنک ریسرچ سنٹر کے ڈائرکٹر پرویز صاحب نے اپنی دو کتابوں میں دیا ہے۔ جن میں کی پہلی کتاب شائع ہوچکی ہے۔ اور اس وقت ہمارے زیرِ تبصرہ ہے۔ انھوں نے اس جامع سوال کو اپنے سامنے رکھا ہے کہ کیا عقلِ انسانی کے مقابلہ میں وحی وہ محکم بنیادیں عطا کرسکتی ہے۔ جن پر انسانی معاشرے کی عمارت استوار کی جاسکے؟

یہ تو رہا سوال۔ اس کا جواب کیا ہے؟ اس کا جواب کہیں سے گھڑا گھڑایا نہیں مل سکتا۔ اس کے جواب کے لئے فقط اتنا کہدینا کافی نہیں کہ اسلام ایک بے مثل اور بے نظیر نظامِ حیات ہے۔ جسے عقلِ انسانی فرداً فرداً یا اجتماعی طور پر کبھی مرتب نہیں کرسکتی

اس کے لئے یہ بتانا ضروری ہوگا کہ عقلِ انسانی نے آج تک اس باب میں کیا کیا تجربات کئے ہیں۔ اور ان تجربوں کا نتیجہ کیا رہا ہے۔ اس طریق سے اس سوال کا جواب پیش کرنا بڑی صبر آزما کوہکنی چاہتا ہے۔ ایسی صبر آزما کہ اس کے تصور سے روح کانپ اٹھے۔ لیکن پرویز جیسا فرہاد اس قسم کی صبر آزما کوہکنی سے کبھی نہیں گھبراتا۔ وہ کسی اور ہی مٹی کا بنا ہوا ہے۔ اس نے اپنی ساری عمر اسی کوہکنی میں صرف کی ہے۔ اس نے شمعِ اقبال سے کسبِ ضیاء کرنے کے بعد علوم حاضرہ کی روشنی میں قرآن پر غور و فکر کرنا شروع کیا۔ اور اس کے لئے قدیم اور جدید جس قدر معلومات کی ضرورت پیش آئی۔ انہیں حاصل کیا۔ اس چیلنج کا جواب وہی دے سکتا تھا۔ جو اس قدر وسیع علم رکھتا ہو۔ اور جس نے قرآن کا اس انداز سے مطالعہ کیا ہو۔ اس کام کے لئے پرویز کی اہلیت میں کیسے کلام ہو سکتا ہے؟

زیرِ نظر کتاب میں مصنف اپنے قارئین کو ان تمام راہوں میں اپنے ساتھ لئے جاتا ہے۔ جن سے انسانی فکر آج تک گذری ہے۔ اس نقطۂ پر خصوصی توجہ دلاتے ہوئے کہ ان مفکرین کی فکری کوششوں نے زندگی کے اہم اور بنیادی مسائل کو سلجھانے میں کیا کیا کچھ کیا ہے۔ اس سفر کا آغاز، مصنف اس بات سے کرتا ہے کہ ذہنِ انسانی نے خارجی کائنات کی کُنہ و حقیقت دریافت کرنے میں کیا کیا کاوشیں کی ہیں۔ شروع میں انسان نے یہی سمجھا کہ یہ کائنات فضا کی پہنائیوں میں مٹی کے ایک بے جان اور غیر متحرک ڈھیلے کی طرح پڑی ہے۔ اس کے سامنے نہ کوئی مقصد ہے نہ غایت۔ نہ اس مقصد کے حصول کیلئے کسی حرکت کی صلاحیت۔ لیکن اب وہ اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ خود مادہ کے متعلق یہ تصور غلط ہے۔ مادہ کسی ٹھوس شے کا نام نہیں۔ یہ تو خود مجرد توانائی اور بسیط حرکت سے عبارت ہے۔ اس سے یہ سوال سامنے آیا کہ اگر مادہ کی اصل حقیقت یہ ہے۔ تو اس توانائی کا سرچشمہ اور اس حرکت کا مبدا کیا ہے۔ اتنا تو انسان نے سمجھ لیا ہے کہ یہ توانائی محض ہنگامی طور پر وجود میں نہیں آگئی۔ لیکن یہ بات ابھی تک اس کی سمجھ میں نہیں آسکی کہ پھر یہ توانائی آئی کہاں سے گئی۔ اور زندگی اور شعور کی اصل ہے کیا۔ انسانی فکر اس باب میں اس وقت اس مقام پر کھڑی ہے اور متحیر کھڑی ہے۔

اس کے بعد مصنف، اپنا رخ اخلاقیات، سیاسیات، معاشیات اور باطنیت کی طرف موڑتا ہے۔ اور یہ بتاتا ہے کہ یہ چیزیں انسان کو کس مقام تک لے آئی ہیں! یہ چیزیں جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں انسان کو موجودہ معاشرے تک لے آئی ہیں۔ جہاں ہر طرف انتشار و اضطراب ہے۔ اس نے فطرت کے بہت سے پوشیدہ خزائن کو بے نقاب کر لیا ہے۔ لیکن یہ قوتیں اس کی معاشرتی دنیا میں امن و سکون اور فلاح و بہبود نہیں پیدا کر سکیں۔ اس کے برعکس یہ قوتیں نہ صرف انسانی تہذیب کے مٹانے ہی کے درپے ہیں۔ بلکہ خود زندگی ہی کو ختم کر دینے کا تہیہ کئے بیٹھی ہیں۔

یہاں سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا انسان سفرِ زندگی کی آخری منزل تک آپہنچا ہے۔ اور اس کے بعد ہلاکت و تباہی کے سوا اور کچھ نہیں؟ اس سوال کا جواب اگر ہم اس علم سے طلب کریں جو انسانی فکر کا حاصل ہے۔ تو جواب یہی ملے گا کہ اب تباہی کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا۔ لیکن اگر ہم وحی سے دریافت کریں تو وہاں سے اس کا جواب مایوس کن نہیں ملتا۔ تیس سال ہوئے اقبال

نے پیام مشرق کے دیباچہ میں لکھا تھا کہ فطرت اپنی گہرائیوں سے ایک نئے آدم اور اس کے رہنے کے لئے ایک نئی دنیا کی تخلیق کر رہی ہے۔ اس لئے انسان کو زندگی کے نصب العین تک پہونچنے کے لئے کوئی چیز روک نہیں سکتی۔ لیکن یہ نصب العین کیا ہے اور اس تک کیسے پہنچا جائے؟ اس کا جواب پرویز صاحب کی کتاب کے دوسرے حصے میں ملے گا۔ جس کا عنوان ہے۔ "خدا نے کیا کہا؟" یہ دونوں کتابیں اس سوال کا مکمل جواب پیش کریں گی کہ کیا وحی انسانی معاشرہ کی محکم بنیاد بن سکتی ہے۔ اور قرآن کس طرح ایک ایسا ضابطۂ زندگی عطا کرتا ہے جو دنیا میں بے مثل و بے نظیر ہے۔ اور جو انسانیت کو اس کی منزل مقصود تک لے جانے کا ضامن ہے۔ اس اعتبار سے مصنف کی زیر تبصرہ کتاب "انسان نے کیا سوچا؟" خاص اہمیت حاصل کر لیتی ہے لیکن اگر اس خاص مقصد سے ہٹ کر بھی دیکھا جائے۔ تو یہ غیر معمولی تصنیف ایک اور اعتبار سے بھی بڑی خوش آئند ہے۔ اس میں ایک جلد کے اندر انسانی فکر اور اس کے حاصل سے متعلق اس قدر معلومات جمع کر دی گئی ہیں کہ وہ کسی اور کتاب میں یکجا نہیں مل سکتیں۔ پھر اس اعتبار سے بھی یہ کتاب ایسی نہیں۔ جیسی عام طور پر معلومات کی کتابیں ہوتی ہیں۔ اس میں انسانی فکر کے ذخیرے کو اس انداز سے ترتیب دیا گیا ہے کہ ہر شعبۂ علم بالکل نکھر کر سامنے آجاتا ہے۔ جہاں تک مذہبی دنیا کا تعلق ہے۔ یہ کتاب ان لوگوں کے لئے روشنی کے مینار کا کام دیگی جو مذہبی افکار کی تشکیل جدید کے اہم فریضہ میں مصروف کار ہیں۔

پرویز صاحب کا اسلوب بیان بھی بڑا رواں اور دلکش ہوتا ہے۔ انھیں زیر بحث موضوع پر اس قدر عبور ہوتا ہے کہ ان کے راستے میں جس قدر سخت مقام آتے ہیں۔ وہ نہایت آسانی اور بے تکلفی سے انھیں عبور کرتے چلے جاتے ہیں۔ علم کی اس قدر بلندیوں کے باوجود، ان کی تحریر میں ایسی جاذبیت ہوتی ہے کہ ایک عام سطح کا غیر فنی انسان بھی اس سے لطف اندوز ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ پرویز صاحب کی تصانیف کو اگر محض ادبی نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو بھی وہ اس قابل ہیں کہ ان کا عام مطالعہ کیا جائے۔

اصول قانون

محترم احمد عبداللہ المسدوسی حیدرآباد (دکن) کے علمی اور قانونی حلقوں میں محتاج تعارف نہیں تھے۔ سقوط حیدرآباد کے بعد وہ کراچی آگئے۔ اور نامساعد حالات کے باوجود انھوں نے مسلسل محنت اور انتھک کوششوں سے یہاں بھی اپنا مقام پیدا کر لیا۔ انھوں نے اپنا پرچہ الشرق نکالا جس سے اندازہ ہوا کہ بین الاقوامی سیاست بالخصوص مشرق وسطیٰ اور مشرق بعید کے الجھے ہوئے مسائل پر ان کی نگاہ کس قدر گہری ہے۔ اب کچھ عرصہ سے وہ اردو کالج میں لیکچرار کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ جس سے انھیں اپنی قانونی صلاحیتوں کی نمود کا موقع مل گیا ہے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے قانون سے متعلق دو کتابیں شائع کی ہیں۔ پہلی کتاب اصول قانون (JURIS PRUDENCE) پر ہے اس موضوع کی اہمیت قانون کے طالب علموں کی نگاہ سے پوشیدہ نہیں۔ مسدوسی صاحب کی زیر نظر کتاب سامنڈ کی کتاب پر مبنی ہے۔ لیکن یہ نہ تو اس کا بجنسہٖ ترجمہ ہے۔ اور نہ ہی خلاصہ۔ اس میں اصل کتاب کی ترتیب اور مباحث کو باقی رکھا گیا ہے اور تفصیلی مباحث اور مثالوں کو چھوڑ دیا گیا ہے۔ اردو اصطلاحات کے ساتھ ساتھ انگریزی اصطلاحات کو بھی درج کر دیا

گیا ہے۔ اور حاشیہ پر کراچی یونیورسٹی کے سابقہ امتحانات کے سوالات دیدیئے گئے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ کتاب قانون کے طالب علموں کے لئے بہت مفید رہے گی۔ کتاب مکتبہ خدام ملت فریئر روڈ کراچی کی طرف سے شائع ہوئی ہے (غالباً عجلت میں شائع ہونے کی وجہ سے) طباعت اچھی نہیں ہوئی۔ ضخامت ۲۶۸ صفحات۔ قیمت بلا جلد ساڑھے چار روپے۔

۲۔ قانونِ روما

مسدوسی صاحب کی دوسری کتاب قانون روما (ROMAN PRIVATE LAW) سے متعلق ہے دنیا کے مروجہ قوانین پر رومن لا جس حد تک اثر انداز ہوا ہے۔ اس سے قانون کے طالب علم ناواقف نہیں۔ اس اعتبار سے قانون روما کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ مسدوسی صاحب کی یہ کتاب خصوص قانونِ روما پر تیج کی مشہور تصنیف پر مبنی ہے۔ اور اول الذکر کتاب کی خصوصیات کی حامل۔ یہ کتاب بھی ایل ایل بی کے طلباء کے لئے بہت مفید ثابت ہوگی۔ ناشر اس کا بھی مکتبہ خدام ملت فریئر روڈ کراچی ہے۔ ضخامت ۱۸۰ صفحات۔ قیمت بلا جلد ساڑھے تین روپے۔

۳۔ ماہنامہ بلاغ القرآن

۱۱۰۔ لٹن آباد لاہور۔ ضخامت سولہ صفحات۔ قیمت فی پرچہ ۴ر سالانہ تین روپے۔

یہ پنجاب کے فرقہ "اہل القرآن" کا ترجمان ہے جو حال ہی میں لاہور سے شائع ہوا ہے اس کا پانچواں شمارہ اس وقت ہمارے سامنے ہے۔ مضامین مسلسل شائع ہو رہے ہیں۔ پہلے مضمون کی زیر نظر قسط میں بتایا گیا ہے کہ وحی کی ایک ہی قسم ہے جو قرآن پر مشتمل ہے۔ دوسرے مضمون میں اس قرآنی صلوٰۃ کی تفاصیل ہیں جنہیں محترم عبداللہ چکڑالوی مرحوم نے مرتب کیا تھا۔ اس مضمون میں مختلف مقامات پر طلوع اسلام کو یہ کہہ کر ہدف تنقید بنایا گیا ہے کہ یہ کہتا ہے کہ انفرادی طور پر کسی کو حق حاصل نہیں کہ ہماری مروجہ نماز وغیرہ میں تبدیلیاں کر کے امت میں مزید انتشار پیدا کیا جائے۔

فرقہ سازی کا بنیادی نقص یہ ہے کہ اس میں انسان حقائق کی بجائے اشخاص کی اتباع اختیار کر لیتا ہے۔ چنانچہ ان اہل قرآن حضرات کا بھی یہ عالم ہے کہ جو کچھ محترم چکڑالوی مرحوم لکھ گئے ہیں۔ وہ ان کے نزدیک حرفِ آخر ہے۔ حالانکہ ہو سکتا ہے کہ قرآن سمجھنے میں انہیں کہیں غلطی لگ گئی ہو۔ مرحوم کے خلوص اور جذبۂ صادقہ کی ہمارے دل میں بڑی قدر ہے۔ قرآن سے ان کا والہانہ عشق بھی درخورِ ہزار تحسین ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک وہ قرآن کے متعلق بنیادی طور پر ایک ایسی غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ اس پر اٹھائی ہوئی ان کے فکرِ قرآن کی ساری عمارت کج ہو گئی۔ اور ان کی عمر بھر کی مخلص جگر کاوی اور دیدہ ریزی قرآنی تعلیم کی نشر و اشاعت کے لئے مفید ہونے کی بجائے مضرت رساں نتائج کا موجب بن گئی۔ ہمارے سامنے جب بھی اس کا تصور آتا ہے۔ اس احساس سے بید قلق ہوتا ہے۔ ہمیں اگر اس کا یقین نہ ہوتا کہ فرقہ بندی میں انسان اس قسم کی کوئی بات سنا نہیں کرتا۔ تو ہم ان حضرات کی خدمت میں باادب گذارش کرتے کہ جو باتیں وہ پیش کر رہے ہیں۔ ان میں جان نہیں ہے۔ اس لئے بہتر ہو کہ وہ اپنی توانائیوں کو کسی مفید مقصد کے حصول کے لئے صرف کریں۔

سلیم کے نام خط آئندہ پرچے میں آرہا ہے

گذری ہوئی کہانیاں

ہم اس سے پہلے بھی لکھ چکے ہیں کہ ہماری نشاۃِ ثانیہ کی کوششوں میں جو مقام سرسید مرحوم کو حاصل ہے، اس سے ہمارے دور کے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے ایک مبسوط تاریخی تصنیف کی ضرورت ہے لیکن جب تک ایسا ممکن نہیں، ہماری کوشش یہ رہتی ہے کہ سرسیدؒ کے متعلق جہاں کہیں کوئی قابل قدر چیز نظر پڑے اسے پیش ناظرین کر دیا جائے تاکہ اس طرح اندکے اندکے، مسلمانوں کے اس مخلص محسن کا تعارف ہوتا جائے۔ اسی ضمن میں ہم، ذیل میں سرسیدؒ کی زندگی کے چند واقعات درج کرتے ہیں، جو ظفیر الدین صاحب صدیقی کے قلم سے، دہلی کے رسالہ برہان میں شائع ہوئے ہیں ان واقعات سے اندازہ ہو سکے گا کہ مبدأ فیض کی طرف سے سرسیدؒ کو ذہن رسا کے ساتھ، کس قدر قلب درد آگیں عطا ہوا تھا۔ مقالہ نگار نے ان واقعات کے ساتھ ساتھ جو تبصرہ کیا ہے ضروری نہیں کہ ہم اس سے لفظاً لفظاً متفق ہوں۔ ہمارا مقصد درحقیقت سرسیدؒ کے زندگی کے ان واقعات ہی کو درج کرنا ہے۔ نہ کہ مصنف کے تبصرہ کو۔ مضمون کے بعض غیر متعلقہ حصے حذف بھی کر دیئے گئے ہیں۔ سرسیدؒ کے ساتھ، کچھ واقعات نواب وقار الملک مرحوم کے بھی شامل مقالہ ہیں۔ ان سے نظر آجاتا ہے کہ سرسید نے قوم میں کس قسم کا ماحول پیدا کر دیا تھا۔ طلوع اسلام]

سرسید احمد خاں بانی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو علمی دنیا میں جو شہرت حاصل ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ ان کے مذہبی خیالات کے متعلق لوگوں میں بلاشبہ مختلف رائیں ہیں۔ مگر جہاں تک اپنی معلومات کا تعلق ہے ان کی بنیاد پر کہہ سکتا ہوں کہ ان کے اخلاص و للّٰہیت کے باب میں دو رائیں نہیں ہو سکتی ہیں۔

مولانا حالی مرحوم لکھتے ہیں۔

> جب سر ولیم میور کی کتاب "لائف آف محمد" چار جلدوں میں چھپ کر ہندوستان پہنچی جس کی نسبت عیسائیوں میں مشہور تھا کہ اس نے اسلام کے استیصال میں کسر نہ اٹھا رکھا، اس وقت جو حال سرسید کی بے چینی اور جوش و خروش کا تھا وہ ہم نے اپنی آنکھ سے دیکھا ہے۔

اللہ اللہ یہ حال ہے اس مسلمان کا جس کو کہا جاتا ہے کہ بعض مصالح کی بنیاد پر انگریزی حکومت اور خود انگریزوں سے بڑا خاص تعلق تھا، تعلقات اپنی جگہ تھے مگر دین کے معاملہ میں دیکھ رہے ہیں کتنے بے چین ہیں اور کیسا ان میں جوش و خروش ہے آج ان کا نام لینے والے

ہر معاملہ میں ان کا بار بار حوالہ دیں گے، مگر جہاں دین کی بات ہو وہاں ان کا سارا حسن ظن رکھا کا رکھا ہی رہ جاتا ہے، اور ان میں کوئی بے چینی پیدا نہیں ہوتی ـــــ مولانا حالی مرحوم ہی کا بیان ہے

وہ (سرسید) جب کبھی اور کاموں سے فارغ ہو کر بیٹھتے تھے، اکثر سر ولیم کی کتاب کا ذکر کرتے تھے، اور نہایت افسوس کے ساتھ کہتے تھے کہ اسلام پر حملے ہو رہے ہیں اور مسلمانوں کو مطلق خبر نہیں۔

اس کو بار بار پڑھئے اور سوچئے، سرسید مرحوم میں کتنی اور کیسی غیرت و حمیت دینی پائی جاتی تھی مگر آہ ان کے نام لیواؤں میں اب یہ غیرت و حمیت دینی کہاں نظر آتی ہے؟ جو دو چار ہیں اُن کو کوئی پوچھتا ہی نہیں، بلکہ اب تو خود اسی یونیورسٹی کے فرزندانِ ارجمند اپنی ہی یونیورسٹی میں بیٹھ بیٹھ کر سر ولیم سے زیادہ سخت حملے کرتے رہتے ہیں، اور ان کو احساس تک نہیں ہوتا کہ یہ تیر کس کا دل زخمی کر رہا ہے، اور کس کے کلیجہ کو چھید رہا ہے

سرسید مرحوم اپنے ایک خط میں اپنے ایک دوست کو لکھتے ہیں

ان دنوں ذرا میرے دل کو سوزش ہے ولیم میور صاحب نے جو کتاب آنحضرت صلعم کے حال میں لکھی ہے اس کو میں دیکھ رہا ہوں، اس نے دل کو جلا دیا، اور ان کی ناانصافیاں اور تعصبات دیکھ کر دل کباب ہو گیا۔

یہ اس شخص کی گواہی ہے جو جدید تعلیم یافتوں کا امام ہے۔ کیا اس کے بعد بھی یقین نہ ہوگا کہ عیسائیوں نے مذہب اور دین کی باتوں کے بیان کرنے میں بڑی ناانصافیاں کی ہیں۔ بیجا تعصب سے کام لیا ہے۔ جن جدید تعلیم یافتوں کے دینی معلومات کا بیشتر ذخیرہ انگریزوں کی لکھی ہوئی کتابیں ہیں ان کو سوچنا چاہیئے، کہ ان کے "دینی معلومات" کی حیثیت پھر کیا رہ جاتی ہے۔؟

ولیم میور وغیرہ نے کتنی گندگی اچھالی ہوگی، کہ سرسید مرحوم کے قلم سے یہ جملے ٹپک پڑے۔

مصمم ارادہ کر لیا کہ آنحضرت صلعم کی سیرت میں جیسا کہ پہلے سے ارادہ تھا، کتاب لکھدی جائے، اگر تمام روپیہ خرچ ہو جائے، اور میں فقیر بھیک مانگنے کے لائق ہو جاؤں تو بلا سے، قیامت میں یہ کہہ کر پکارا جاؤں گا کہ اس فقیر مسکین احمد کو جو اپنے دادا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر فقیر ہو کر مر گیا حاضر کرو

"ما را ہمیں تمغۂ شہنشاہی بس است"

اللہ اللہ یہ ہے محبتِ رسول، اور حمیت دین کا جذبہ، کہاں ہیں وہ لوگ۔ جو سرسید کا نام لے کر اپنی بڑائی جتاتے ہیں اور ان کی غیرت و حمیت جواب دے گئی ہے، وہ ہر جائز و ناجائز شعبہ میں تو خرچ کر سکتے ہیں، مگر دین کی عزت و عظمت کی خاطر ایک پیسہ خرچ کرنا جرم سمجھتے ہیں، حد یہ ہے کہ اس سلسلہ میں زبان کھولنے کی بھی ان کو جرأت نہیں ہوتی، دماغی عیاشی کے لئے سینکڑوں ناول اور ڈرامے لکھ سکتے ہیں۔ مگر دین کی عظمت اور اس کی سربلندی کے لئے ایک جملہ لکھنے میں بھی شرم محسوس کرتے ہیں، اور سوچتے ہیں اس کا کیا معاوضہ ملے گا۔

سرسید مرحوم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر کئے گئے اعتراض کا صرف جواب ہی نہیں لکھا، بلکہ اس کے چھپوانے کی صورت بھی خود ہی سوچی، اور کتابت و طباعت کے اخراجات کی خود ہی فکر کی۔ اس سلسلہ میں سید مرحوم لکھتے ہیں۔

میں چاہتا ہوں کہ آپ اس خط کے پہنچنے کے بعد میر ظہور حسین کے پاس جائیں .... اور دونوں صاحب مل کر کسی مہاجن سے ہزار روپیہ قرض لیجئے، سود اور روپیہ میں ادا کروں گا .... ہزار روپیہ بھیجنے کے لئے دتی لکھا ہے اور میں نے لکھا ہے کہ کتابیں اور میرا اسباب یہاں تک کہ مرے ظروف مسی تک فروخت کرکے ہزار روپیہ بھیج دو۔

اس وقت سودی لین دین کی بحث چھوڑیئے۔ اور ایمانداری سے سید مرحوم کے بے پناہ ایمانی جذبہ اور دینی غیرت و حمیت کا اندازہ لگائیے اور دیکھئے کہ ان کے جوش و خروش کا کیا عالم ہے اور وہ کس قدر بے چین ہیں، اور لندن میں بیٹھ کر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت کا کیسا حق ادا کر رہے ہیں، اس سلسلہ میں نہ انگریزوں کے علوم و فنون سے مرعوب ہوتے ہیں اور نہ حکومتِ وقت سے خوف زدہ۔

آج جس یونیورسٹی کے بانی کے ایمان و عمل کا یہ حال ہے، آج اس ادارہ کے منتسبین یا فنتوں کی دینی حالت قابلِ صد افسوس ہے۔ دنیاوی لحاظ سے بلاشبہ یہ بہت اونچے، بلند خیال، بلند اقبال اور ہر طرح قابلِ مدح و ستائش ہیں، مگر جہاں تک دینی غیرت و حمیت اور ایمان و عمل کا تعلق ہے اس اعتبار سے کہا جاسکتا ہے کہ بجز چند افراد بانیٔ ادارہ کے ساتھ ان کو کوئی خاص گرویدگی نہیں۔ کاش لوگ سوچتے کہ بانی ادارہ کا مقصد جہاں دنیا کے اونچے عہدے حاصل کرنا تھا، وہاں یہ بھی مقصد تھا کہ مسلمان ان اونچے عہدوں پر رہ کر رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین کی خدمت انجام دیں، اور اس دین پر جہاں سے زد پڑ رہی ہو، اس کا دروازہ بند کرنے کی سعی کریں۔

سرسید مرحوم میں جس طرح دینی غیرت تھی، اسی طرح آپ کو مسلمان اور مسلمانی تاریخ سے محبت تھی، چنانچہ کوئی مؤرخ و مصنف اگر اپنی کتابوں میں مسلمانوں کے ساتھ ناانصافی کرتا اور آپ کو معلوم ہوجاتا تو برداشت نہیں کرتے تھے۔ اس سلسلہ میں آپ نے ایک مرتبہ محسن الملک کو لکھا۔

انگریزوں نے مسلمان بادشاہوں اور مسلمان حکومتوں کی تاریخیں نہایت ناانصافی اور تعصب سے لکھی ہیں اور کوئی برائی نہیں ہے، جو مسلمانوں کی طرف منسوب نہ کی ہو۔

کہاں ہیں انگریز مصنفوں کے کلمہ گو! آنکھیں کھول کر دیکھیں سید مرحوم جیسے۔ دانا اور انگریز دوست کا کیا خیال ہے یہ کوئی دیوبندی مولوی کا بیان نہیں، بلکہ مسلم یونیورسٹی کے بانی کی تحریر ہے، علیگ بھائی بھی اسے غور سے پڑھیں، جو انگریز مصنفوں کی تاریخوں پر بغیر کافی تحقیق یقین کر لیتے ہیں، اور بیچارے مسلمان محقق مصنفوں کو اپنے خیال میں کوئی وقعت نہیں دیتے۔ اور حد یہ ہے کہ فارسی عربی اور اردو صحیح تاریخوں کا پڑھنا ان کو بار گذرتا ہے۔

انگریز مصنفوں کی بے ایمانی کا راز فاش کرنے کے بعد سرسید مرحوم آگے رقمطراز ہیں۔

ہماری قوم کے جوان لڑکے انگریزی میں انھیں تاریخوں کو پڑھتے اور دیکھتے ہیں جس سے یہ نقص پیدا ہوتا ہے اور جو بات ازراہِ ناانصافی اور تعصب مسلمانوں کی نسبت لکھی گئی ہے اس کو وہ سچ اور واقعی سمجھتے ہیں۔

جس خطرہ کی طرف اشارہ کیا گیا تھا افسوس آج تک اس خطرہ کا تشفی بخش انسداد نہ ہو سکا سرسید مرحوم نے جس زہر سے مسلمان بچوں کو بچانا چاہا تھا، بعد میں چل کر اس کے ماننے والوں کو اس کا صحیح احساس باقی نہ رہا۔

علیگ برادری نے جتنا دھیان ناول اور افسانے پر دیا، کاش ہو اس کا کوئی ادنیٰ حصہ تاریخ پر صرف کرتے، تو آج اردو میں صحیح تاریخوں کا بڑا ذخیرہ ہوتا۔ (........)

لندن میں رہ کر سرسید مرحوم ایک ایک چیز کو عبرت و بصیرت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور مسلمانوں کی حالت پر آنسو بہاتے ہیں، ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں۔

مگر ہماری قسمت میں وہی جلنا ہے، یہاں کا حال دیکھ دیکھ کر اپنے ملک اور اپنی قوم کی حمایت اور بیجا تعصب اور تنزل موجودہ اور ذلت آئندہ کے خیال سے رنج و غم زیادہ بڑھ گیا ہے

جو اپنی قوم کو کہیں نہیں بھولتا، دوسروں کی ترقی دیکھ کر اپنی قوم کے تنزل پر آنسو بہاتا ہے، اور ان اسباب کو تلاش کرتا ہے جن کی وجہ سے قوم پامال ہو رہی ہے ...... دنیا سن کر سکتے میں آجائے گی کہ آج اُن کے نام لیواؤں کی بڑی جماعت بے حسی کی زندگی گذارتا ہے، اور غفلت کی نیند سوتی ہے، آج اس جماعت کے پیش نظر صرف اپنا ذاتی فائدہ ہے اور بس،

یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ سب کے سب ایسے ہی ہیں، بلکہ وہ باکمال اور حساس افراد بھی ہیں جو رات دن قوم کی خیر خواہی میں دل و جان سے منہمک ہیں۔

سرسید مرحوم نے مسلمانوں کی اسی حالت کا ماتم کیا ہے۔

افسوس کہ مسلمان ہندوستان کے ڈوبے جاتے ہیں اور کوئی ان کا نکالنے والا نہیں ہے، ہائے افسوس امرت تھوکتے ہیں، اور زہر نگلتے ہیں، ہائے افسوس ہاتھ پکڑنے والے کا ہاتھ جھٹک دیتے ہیں، اور مگر کے منہ میں ہاتھ دیتے ہیں۔

مگر آہ کس کو بتایا جائے کہ تم جہاں جا رہے ہو وہاں کھرے سکے نہیں ملتے، کھرے سکوں کی تلاش ہو تو ہمت سے کام لو، مرعوب ہونا ترک کرو، بہادر اور نڈر بنو، اور اپنے ملک و قوم کی خیر خواہی میں لگ جاؤ، نتیجہ خدا کے ہاتھ ہے، تمہارا کام جد و جہد کرنا اور قوم کو راہ راست دکھانا ہے۔ سرسید مرحوم نے ایک مرتبہ وقار الملک کو لکھا تھا۔

میں قسمیہ آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ مجھے مسلمانوں کی بہتری، ترقی اور درستی اخلاق کی جس پر میں کوشش کر رہا ہوں مطلق توقع نہیں ہے مایوسی محض ہے مگر اس خیال سے کہ ہمارا فرض کوشش کئے جانا ہے کرتا ہوں۔ پس جس چیز کے حصول سے مایوسی ہو، اس مایوسی کے سبب سے اپنا فرض کوشش ترک نہیں ہو سکتا۔

یہ ہے اپنے فرض کا احساس، آج جدید تعلیم یافتوں کو کون بتائے کہ آپ کی ذمہ داری بھی بڑی اہم ہے، مگر آپ کو احساس نہیں، آپ بس پڑھنا اور کھانا کمانا ہی اپنا فرض سمجھتے ہیں، یہ محض غلط ہے، مفت مولویوں کو ہر چیز کا ذمہ دار قرار دے کر مطعون کرنا یہ ذمہ داری کا احساس نہیں ہے، آزاد ہندوستان میں دینی جذبہ سے کر آگے بڑھنے اور قومی خدمت کی بڑی گنجائش ہے۔

جو لوگ سمجھتے ہیں کہ سرسید عربی فارسی کے بالکل خلاف تھے وہ بالکل غلط ہے۔ اسی طرح ہمارے علیگ بھائیوں میں جن کا یہ خیال ہے کہ عربی فارسی کی کوئی اہمیت ہی نہیں وہ بھی بھول میں ہیں سرسید مرحوم نے ایک بار عماد الملک کو لکھا تھا

اسی کے ساتھ یہ تدبیر بھی چاہتا ہوں کہ علوم عربیہ اور درس کتب مذہبی جو معدوم ہوتا جاتا ہے، کسی طرح قائم رہے، اگر عربی فارسی ہم میں سے معدوم ہو جائے۔ تو اسی کے ساتھ ہماری قومیت بھی معدوم ہو جائے گی۔

آہ اب یہ خیال کس کو ہے؟ کہ مذہبی تعلیم اور جس زبان میں اس کا ذخیرہ ہے اس کا حاصل کرنا بھی ضروری ہے، اور اس سے غفلت موت کے مترادف ہے۔ آج عربی داں جب تک جدید تعلیم حاصل نہ کرے اور انگریزی داں جب تک علوم مشرقیہ اور دینی معلومات حاصل نہ کرے، اس کا علم ادھورا ہے، تنگ نظری دونوں ہی میں باقی رہ جاتی ہے، کاش لوگ غور کریں۔

سرسید مرحوم ایک زندہ دل اور با اخلاق انسان تھے، اور ان کا مطمح نظر نیکی کرنا اور برائی دور کرنا تھا، خود فرماتے ہیں:۔

ہم کو خدا نے دنیا میں اس لئے پیدا کیا ہے کہ سب کی بھلائی چاہیں، برا کرنے والے کی برائی سے ہم کو کیا کام، ہم کو اپنا دل اپنی زبان بھلی رکھنی چاہیئے۔ بدوں یا بد طینتوں پر افسوس کرنا چاہیئے، مگر اس سے زیادہ کچھ کرنا خود اپنے کو بھی ویسا ہی کرنا ہے۔ جو لوگ برا کہنے والے ہیں، ان کی نسبت ہم کو صبر و تحمل چاہیئے، اگر وہ برائی ہم میں ہے تو اس کے دور کرنے میں کوشش لازم ہے

یہ ہیں ہمارے گذرے ہوئے بزرگوں کے اخلاق و اعمال، برائی ان کے وہم میں بھی نہیں آتی تھی، بس نیکی ہی نیکی ان کے مدنظر رہتی، برائی کا جواب بھی نیکی ہی سے دیا کرتے، تاکہ برائی دور ہو، اب یہ اخلاق و اعمال اور صبر و تحمل ہم لوگوں میں کہاں باقی رہا؟ جو لوگ آپ سے روحانی وابستگی رکھتے ہیں ان کو سوچنا چاہیئے، کہ ہمارے اخلاق و اعمال کیونکر سدھر سکتے ہیں۔

بانی علیگڈھ کا دل میل کچیل اور کینہ کپٹ سے پاک تھا، ایک دفعہ محسن الملک کو ان کے خط کے جواب میں لکھا۔

مولوی س۔ خ کو اب بھی میں اپنے بھائی سے کم نہیں سمجھتا، مگر جو ملال کہ مرے دل میں ہوا، وہ اب تک کم نہیں ہوا، پھوٹ جاوے وہ آنکھ، جو کسی کو دیکھے اس نگاہ سے، جو اس کے دل میں نہیں ہے، گل جاوے وہ زبان، جو وہ کہے جو اس کے دل میں نہیں ہے اور ٹوٹ جاوے وہ ہاتھ، جو وہ لکھے جو اس کے دل میں نہیں ہے۔

دیکھ رہے ہیں منافقت سے بیزاری کا اعلان اور اخلاص عمل کا اظہار، اب تو اس نیکی کو لوگ بے وقوفی کہتے ہیں، وہ بڑا اگدھا سمجھا جاتا ہے جس کا عمل دل کے مطابق ہو، اب کمال یہ ہے کہ دل میں کٹاری ہو، اور زبان شیریں، دل میں برائی ہو، اور زبان پر تعریف، علیگ برادری اپنے بانی کی اس تحریر کو بار بار پڑھے اور سوچے کہ کیا ہمارا طرز عمل یہی ہے، جس کی بانی یونیورسٹی تعلیم دے گئے ہیں۔

سرسید مرحوم کو اپنی قوم سے بڑی ہمدردی تھی۔ اور قوم و ملت کا غم اتنا غالب تھا کہ وہ اپنا سارا غم فراموش کر گئے تھے، ایک موقع سے انہوں نے ایک انگریز مسٹر شکسپیر کی مدد کی تھی، اس مدد کے سلسلہ میں ان کو ایک جاگیر دینا چاہی مگر انہوں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ خود لکھتے ہیں:۔

جب ہمارے دوست مرحوم شکسپیر نے جن کی مصیبتوں میں ہم اور ہماری مصیبتوں میں وہ شریک ہوئے اس وفاداری کے صلہ

جہاں آباد جو سادات کے ایک نہایت نامی خاندان کی ملکیت تھا اور لاکھ روپے سے زیادہ کی مالیت کا تھا، مجھ کو دینا چاہا، تو مرے دل کو نہایت صدمہ پہنچا، میں نے اپنے دل میں کہا کہ مجھ سے زیادہ کوئی نالائق دنیا میں نہ ہوگا، کہ قوم پر تو یہ بربادی ہو، اور میں ان کی جائیداد لے کر تعلقہ دار بنوں میں نے اس کے لینے سے انکار کیا۔

اللہ اللہ یہ تھا درد دل قوم و ملت کے باب میں، ایک لاکھ کی جاگیر پر لات مار دی اور اپنی غیرت و حمیت کی لاج رکھ لی، سوچا جائے اب ایسے لوگ کہاں باقی رہے اب تو لوگ کوشاں ہوتے ہیں کہ کسی کی گردن مروڑ کر ہم اس کی جائیداد پر قابض ہو جائیں۔

کہاں ہیں وہ بااثر حضرات جو رات دن دوسروں کو برباد کرنے کی فکر میں رہتے ہیں اور اپنی ادنیٰ کمائی کی بڑی قیمت مانگتے ہیں، چاہے..... ..... دوسرے کے بال بچوں کی لاشوں کو روندنا ہی کیوں نہ حاصل ہو۔ اس واقعہ سے سبق حاصل کریں۔

۱۸۵۷ء میں بہت سے لوگ بددل ہو کر ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے۔ حالات دیکھ کر سرسید مرحوم کو بھی پہلے خیال آیا کہ ہندوستان چھوڑ دیں مگر حالات کا جب انہوں نے گہری نظر سے مطالعہ کیا تو سمجھ میں آیا کہ مرا خیال غلط ہے، چنانچہ خود لکھتے ہیں۔

یہ خیال پیدا ہوا کہ نہایت نامردی اور بے مروتی کی بات ہے، کہ اپنی قوم کو تباہی کی حالت میں چھوڑ کر میں خود کسی گوشۂ عافیت میں جا بیٹھوں۔ نہیں اس کے ساتھ مصیبت میں رہنا چاہیئے اور جو مصیبت پڑی ہے اس کو دور کرنے میں ہمت بھر مدد قومی فرض ہے، میں نے ارادۂ ہجرت موقوف اور قومی ہمدردی کو پسند کیا۔

اسے کہتے ہیں اپنی قوم سے سچی ہمدردی، اپنا آرام دیکھ کر پوری قوم کو بھول جانا کسی قومی لیڈر کا کام نہیں ہو سکتا، کسی اور کا ہو تو ہو سکتا ہے، مگر آہ اسی بوڑھے سپاہی کی یونیورسٹی کے وہ بلند اقبال فرزندانِ ارجمند، جو کل تک ہندوستان میں تھے، مگر جوں ہی پاکستان میں ان کو اطمینان بخش جگہ ملی، یہاں سے بھاگ گئے، یہ بھی نہ سوچا کہ اس یونیورسٹی کا کیا ہوگا۔ کل تک جن غریب عوام مسلمان کا نام لے کر ہمنے لیڈری اور برتری حاصل کی ہے، اس کا کیا حشر ہوگا۔ یہی نہیں بلکہ جب موقع آیا تو بے دردی سے مسلمانوں کو آگ و خون کی بارش میں ڈھکیل دیا، اور خود ہوائی جہاز پر بیٹھ کر اڑ گئے، خدا جزائے خیر عطا کرے ان لیڈرانِ عظام اور علمائے کرام کو، جنہوں نے جان کی بازی لگا کر اس دیکھتے جہنم میں مسلمانوں کی جان بچائی۔ اور ساری مصیبتوں سے دوچار ہو کر اب تک یہاں ڈٹے ہیں، اور قوم و ملک کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔

مسٹر محمود جو سرسید کے فرزند ارجمند ہیں، بہت ذہین، حاضر الذہن اور دور اندیش تھے، چنانچہ جسٹس محمود کا فیصلہ مدلل و مکمل ہونے میں جو شہرت رکھتا ہے وہ کسی باخبر سے پوشیدہ نہیں، ان کے متعلق بیان ہے کہ ان کے دل میں خدا کا خوف بہت تھا، ملازمت سے سبکدوش ہو کر جب پنشن پانے لگے تو قرآن پاک اپنے خاص انداز میں پڑھتے اور روتے جاتے تھے، شیخ ممتاز حسین نے لکھا ہے۔

گرمی کے موسم میں ایک صبح کو یہ دیکھا گیا کہ سکندر باغ (لکھنؤ) کے سبزہ زار پر پلتھی مار کر محمود صاحب بیٹھے زبانی کچھ پڑھ رہے ہیں، ان کے یہاں رہنے والے ایک صاحب سے معلوم ہوا، کہ ان کو قرآن شریف کا ایک پارہ زبانی یاد ہے۔ کچھ دنوں سے اکثر یہ صبح کو تنہائی میں رب العلمین کا وعیان دل میں رکھ کر اسے پڑھتے ہیں۔

اور اس کے بعد چند اشعار دنیا کی بے ثباتی کے جو انہیں یاد ہیں پڑھ کر روتے ہیں۔۔۔ میں صبح کو جلنے نکلا تھا

دُوسرے ہیں نے خود یہ سماں ایک بار دیکھا کہ محمود صاحب آنکھیں بند کئے کچھ پڑھ رہے ہیں اور آنکھوں کے

آنسو رواں ہیں۔

یہ ایک انگریزی داں کا صحیح واقعہ ہے، جو اپنے علم و عقل، اور فہم و تدبر میں مسلم ہے۔ غور کیجئے اللہ کے بندہ پر اپنے آقا اور مالک کا کیا خوف تھا، یہ کوئی مُلّا نہیں تھے، بلکہ لندن کے پڑھے ہوئے، اور اپنے وقت میں بڑی شہرت و عزت کے مالک، آہ اب تو ہمارے انگریزی دانوں کو قرآن سے لگاؤ ہی نہیں باقی رہا، اب تو اکثریت ایسی لوگوں کی ہے جنہوں نے کبھی قرآن پاک پڑھا ہی نہیں ہے، بس سنتے چلے آئے ہیں، خشیت ایسی دلوں میں اب کہاں پیدا ہوتی؟ اب تو یہ لوگ اپنے کو مہذب و متمدن کہتے ہیں، ان کی دنیا ہی اور ہے، بوڑھے ہونے پر بھی موت کی تیاری نہیں کرتے، کہ قیامت میں ذلت و رسوائی سے رستگاری ہو سکے۔ اس باب میں عالموں کا حال بھی کچھ زیادہ اچھا نہیں۔

مولوی بشیر الدین (اٹاوہ) پہلے سرسید کے مخالفوں میں تھے۔ ان کا بیان ہے کہ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے چوتھے اجتماع میں میں نے ایک تجویز پیش کی، اور اس پر ایک زوردار تقریر کی، تجویز یہ تھی کہ ڈیلی فورس کی "تاریخ ہندوستان" جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کو مسخ کر کے اہانت آمیز انداز میں پیش کیا گیا ہے، نصاب سے حکومت خارج کر دے۔

مولوی بشیر الدین صاحب فرماتے ہیں کہ اس تجویز پر

> سرسید بولنے کھڑے ہوئے تو عالم ہی کچھ اور تھا، ایک ایک لفظ میں دینی حرارت سمائی ہوئی تھی، اور جوش اسلامی کا دریا تھا جو امنڈ رہا تھا، میں کچھ ہکا بکا سا رہ گیا۔۔۔۔۔۔ اور مجھے پہلی بار اندازہ ہوا کہ یہ شخص ناموسِ اسلام کا سچا محافظ، دین رسالت مآب کا سچا پیرو، اور قوم کا سچا ہمدرد ہے"۔

یہ ایک ناقد اور مخالف کی گواہی ہے، اس کے بعد سرسید کے اخلاص پر شبہ کرنا ظلم ہوگا، غور کیجئے اس مرد مسلمان کے دل میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی کتنی محبت تھی، اور آپ کی تعلیمات سے اس کو کتنا عشق تھا، آہ اب مہذب اور متمدن کہے جانے والوں میں دین کی یہ عظمت کہاں باقی رہی؟ اب تو کچھ لوگ آپ کے نام کے ساتھ صلی اللہ علیہ وسلم بھی نہیں لگاتے، "محمد صاحب" کہا کرتے ہیں، اور ان کو احساس تک نہیں ہوتا کہ ہم ادب کے طریقے کو چھوڑ کر گستاخی کر رہے ہیں۔ اور اگر کسی مصلحت وقت کی وجہ سے زبان پر دین کا نام آتا بھی ہے، تو دل پر اس کا اثر نہیں پڑتا۔

مولوی بشیر صاحب ہی کا بیان ہے کہ سرسید کسی کو دبانا نہیں چاہتے تھے، ہر ایک کو اپنی رائے کے اظہار کا موقع دیتے، اور پھر اپنا نقطۂ نظر بہت نرمی سے پیش کرتے تھے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:۔

> سرسید میں لاکھ روپے کی ایک خوبی یہ تھی کہ وہ اپنے ہر نیازمند کو کھل کر بات کرنے کا موقع دیتے تھے جب مخالف کے متعلق ان کو محسوس ہوتا تھا کہ وہ سچائی کے ساتھ ان کے مشن کی مخالفت کر رہا ہے اس کی مخالفت کو بڑی قدر کی

نگاہ سے دیکھتے تھے اور بڑے اہتمام سے تسکین بخش انداز میں اس کے اعتراضات کے جوابات دیتے تھے۔

اب یہ انداز فکر اور یہ اخلاق ہمارے مہذب دوستوں میں کہاں باقی رہا؟ اب تو کوئی اپنے نقطۂ نظر کے خلاف ایک بات بھی سننے کے لئے تیار نہیں، چاہے کہنے والا کتنا ہی مخلص کیوں نہ ہو۔

مولوی بشیر صاحب فرماتے ہیں

> ایک بار میں نے ان سے کہا کہ آپ نے مسلمانوں میں جدید تعلیم رائج کرنے کا جو کام شروع کیا ہے یہ تو بہت اچھا ہے یہ بتایئے کہ مذہبی معاملات کو کیوں چھیڑ دیا۔۔۔۔۔۔۔ ہنسے اور فرمایا کہ بھائی اگر میں یہ سوال نہ چھیڑتا، تو مسلمان کبھی کالج کی طرف توجہ نہ کرتے۔

اس واقعہ سے کتنی سچائی ٹپکتی ہے، معلوم ہوتا ہے سرسید دل کے بہت صاف، اور دماغ کے سلجھے ہوئے آدمی تھے، جھوٹ اور فریب کو برا جانتے تھے، اب تو لوگ ایک غلط بات کے لئے سو جھوٹ بولتے ہیں، اور لفاظی سے اسے صحیح ثابت کرنے کی خواہ مخواہ سعی کرتے ہیں، چاہے ان کو اس سلسلے میں ذلت و رسوائی سے دوچار ہی کیوں نہ ہونا پڑے۔

علی گڑھ مدرسہ کی بنیاد پہلے مولوی سمیع اللہ مرحوم نے ۱۸۷۵ء میں رکھی، اس وقت سرسید بنارس میں تھے، مگر اس کی باضابطہ بنیاد ۱۸۷۷ء میں رکھی گئی اور اس میں مولوی سمیع اللہ کے ساتھ سرسید بھی شریک تھے، اس ابتدا کا ایک مؤثر واقعہ مولوی بشیر صاحب بیان کرتے ہیں جو خود مولوی سمیع اللہ نے ان سے بیان کیا تھا۔ کہتے ہیں

> خود مولوی سمیع اللہ نے مجھ سے بیان کیا، کہنے لگے "میں اور سرسید نماز تہجد کے وقت اٹھ کر میدان تعمیر میں گئے، سہانا روح پرور وقت، فضا کی خاموشی، طبیعتوں میں قومی ہمدردی اور دینی حمیت جوش زن، ایک عجیب کیفیت طاری تھی، سرور انگیز بھی تھی، رقت آمیز بھی، اور عبرت خیز بھی مغلیہ سلطنت کی تباہی کے بعد ارض ہند پر ملت اسلامیہ کی یہ پہلی بنائے تعمیر تھی، زندگی اور ترقی کے خواب کی پہلی تعبیر، جوش سے طبیعت میں گریہ طاری ہو گیا، ہم دونوں روتے جاتے تھے، رب ذو الجلال کے سامنے اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے جاتے تھے، اور اس کے فضل و بخشش کے لئے زبان پر دعا تھی، سرسید مجھ سے اصرار کرتے تھے کہ میں سنگ بنیاد رکھوں، اور میں سرسید سے اصرار کرتا تھا، آخر میں سرسید کا اصرار غالب آگیا، میں نے انتہائی رقت قلب کے ساتھ یہ فریضۂ مسعود انجام دیا۔

جس ادارہ کی بنیاد رکھنے والوں نے قلب کی اس رقت کے ساتھ رکھی ہو بتایا جائے کہ اس خدمت کی قبولیت میں کیا شبہ ہو سکتا ہے اللہ اللہ کیسا اخلاص ہے، روتے جارہے ہیں اور اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے جارہے ہیں، خدا جانتا ہے ایسی بنیاد کبھی بھی بے ثمر نہیں ہو سکتی آج مسلم یونیورسٹی کی ساری کامیابی انہی بزرگوں اور مخلصوں کی نالۂ صبحگاہی اور گریہ و بکائے نیم شبی کا نتیجہ ہے، کیسے بتاؤں کہ اب یہ سوز و گداز، یہ خلوص و للہیت عنقا ہے آدمی کی زبان پر تو سب کچھ ہوتا ہے مگر اس کے دل میں کوئی چیز نہیں ہوتا۔ خدا گواہ ہے آج ہماری

ناکامیابی کی بنیادی وجہ یہی اخلاص وللٰہیت اور خضوع وخشوع کا فقدان ہے۔

ہمارے علیگ بھائی اس واقعہ کو بار بار پڑھیں اور سوچیں ان کے اسلاف میں خشیت الٰہی کیسی رچی ہوئی تھی، آہ بے لوث خدمت کا جذبہ قوم کے ساتھ ایسی عاشقانہ محبت اور اپنی ذلت ومسکنت کا رب العزت کے آگے اس طرح اعتراف اب پچھلوں میں کہاں رہا؟ کاش ہم سمجھتے اور بچا سے سوچتے،

مولوی سمیع اللہ کا خلوص علی گڑھ کی تاریخ میں سنہرے حروف سے لکھے جانے کے لائق ہے بعد میں سرسید اور مولوی سمیع اللہ مرحوم کا اختلاف اس حد تک بڑھا کہ ترک تعلقات کی نوبت آگئی، مگر باایں ہمہ مولوی سمیع اللہ مرحوم نے کالج کی کبھی برائی نہ چاہی، مولوی بشیر الدین صاحب ہی کا بیان ہے۔

> اس افسوسناک صورتحال کے بعد مولوی سمیع اللہ کالج کے انتظامی امور سے بہت حد تک دستکش رہے، لیکن کالج کے ساتھ ان کی ہمدردیاں اس دور میں بھی باقی رہیں، کالج کے جو طلبا ان سے ملنے جاتے تھے دل کھول کر ان کی مدد کرتے، ان کو بہت مخلصانہ مشورہ دیتے اور خیر وترقی کی تلقین فرماتے۔

میں اپنے علیگ بھائیوں سے ہی پوچھتا ہوں کہ وہ ایمانداری سے بتائیں کہ کیا یہ جذبہ اب ہمارے بڑوں میں باقی رہا؟ اور کیا اب بھی نیک نیتی کا وہی عالم ہے جو ہمارے پہلوں میں تھا؟ اب تو بصد حسرت وافسوس کہنا پڑتا ہے۔ ع

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

محسن الملک نے سرسید مرحوم کا ایک عجیب پُراثر واقعہ بیان کیا ہے جس کے راوی مولوی بشیر الدین صاحب ہی فرماتے ہیں۔

> یہ واقعہ انہوں نے مجھے خود بتایا ہے، سرسید سے خاصی بحث رہی، رات میں سو رہے تھے کہ گریہ وزاری کی آواز آئی دیکھا تو معلوم ہوا سید احمد خاں رو رہے ہیں، پوچھا کیا گھر سے کوئی تار آیا ہے، سرسید نے جھلا کر جواب دیا کہ پوری قوم تباہ ہوگئی اور تم پوچھتے ہو گھر سے کوئی تار آیا ہے۔

اس سوز وگداز کو ملاحظہ فرمایئے، رات کی تنہائی میں قوم کی بربادی پر رونے والا، اور ملت اسلامیہ کی تباہی پر آنسو بہانے والا اگر کامیاب نہ ہوتا تو پھر دنیا میں کون کامیاب ہوتا، سرسید مرحوم کے اسی خلوص اور سوز وگداز کا نتیجہ تھا کہ رب العزت نے اسے ہر طرح کی کامیابی عطا فرمائی، اور ہر طرح کی عزت سے نوازا۔

اس واقعہ میں ہمارے مہذب لیڈروں اور متمدن جوانوں کے لئے بڑا عبرت آموز سبق ہے، کاش وہ پڑھیں اور اثر قبول کریں۔

وقار الملک کا حصہ علی گڑھ کے قیام میں کسی سے کم نہیں، ان کی بڑی خوبی حق گوئی تھی۔ کبھی اس سلسلہ میں رو رعایت نہ کی، عموماً رائے میں سرسید کے مخالف رہتے، کیونکہ وقار الملک میں مذہبیت اور آئین وضابطہ کی پابندی بہت تھی، لکھا ہے۔

> سرسید کا انتہائی احترام کرنے کے باوجود انہوں نے اپنی رائے میں فرق نہ آنے دیا، اور کھلے طور پر ان کی مخالفت کی، البتہ یہ ان کی اعلیٰ ظرفی تھی کہ جب اکثریت نے اس کو پاس کر دیا تو انہوں نے انتہائی خندہ پیشانی سے

سر تسلیم خم کر دیا۔

یہ وقار الملک کے اخلاص کی دلیل ہے، اپنا نقطۂ نظر پوری قوت سے پیش کرتے، مگر جب اکثریت نے اس کو نہ مانا تو پھر یہ اصرار نہ کیا کہ یہی بات کیوں نہ ہوئی، ہمارے اس دور میں تو کچھ اور ہی معاملہ ہے۔ اگر کسی کی بات نہ رہی تو وہ ایک مخالف پارٹی کا روپ دھار لیتا ہے، اور یکسر ادارہ کی ہی مخالفت میں سرگرم عمل ہو جاتا ہے، آج کوئی غور کرنے کے لئے تیار نہیں کہ جو حق اس کو ہے کیا وہی حق اور لوگوں کو بھی حاصل ہے یا نہیں، اگر سب یہی کرنے لگیں تو ادارہ کا کیا حال ہو۔ اور غالباً اسی کا نتیجہ ہے کہ ہمارا کوئی اجتماعی ادارہ آج کامیاب نہیں ہوتا۔

> حیدرآباد میں ان (وقار الملک) کی کوٹھی میں ایک کوٹھری تھی، جس میں ایک اندھا فقیر رہتا تھا، اس کو کھانا نواب صاحب ہی کے مکان سے جاتا تھا، ایک دن زور کی بارش ہو رہی تھی، انہوں نے نوکروں سے کہا، کہ اندھے کو کھانا پہنچا دیا جائے، بارش کے سبب نوکروں نے تعمیل ارشاد میں تامل کیا، اور گویا بات ٹال گئے، نواب صاحب (یعنی وقار الملک) خاموشی سے اٹھے، کھانا لے کر اس اندھے کے پاس گئے، اور بڑی محبت سے اسے کھانا کھلایا۔

یہ اخلاق تھا نواب صاحب کا، جو کسی اعتبار سے آج کل کے کسی رئیس اور تعلیم یافتہ سے کم نہ تھے۔ جو کام ان کے نوکروں پر بار تھا، اسے خود بنفس نفیس کیا اور کس دل چسپی سے کیا کہ کوئی بار محسوس نہ کیا، اور یہ خدمت بھی کس کی کی؟ ایک اندھے فقیر کی۔

غور فرمائیں آج کوئی مالدار تعلیم یافتہ ایسی خدمت کے لئے آپ کو تیار پاتا ہے، خدا گواہ ہے خاص خاص لوگوں کو چھوڑ کر یہ جذبہ "فقیر نوازی" عنقا ہو چکا ہے، آج کا مہذب طبقہ دوسری دنیا کا انسان ہے۔ اسے انسانی ہمدردی چھو نہیں گئی ہے، ہمارے اس دور میں یہ خدمت ننگ و عار کے مرادف سمجھی جائے گی، ایک ادنیٰ کا کام اعلیٰ کرے؟ کیسے ہو سکتا ہے، اب تو مالدار اپنے سگے غریب بھائی سے ملنا اپنی ذلت سمجھتا ہے، ایک گریجویٹ بھائی، اپنے جاہل بھائی کو منہ لگانا سب سے بڑا گناہ جانتا ہے، مگر یہ حضرات سوچتے نہیں کہ یہ اخلاقی بلندی نہیں انتہائی گراوٹ ہے — اور بڑوں کی بات تو جانے دیجئے آج ایسی "فقیر نوازی" کو معمولی انسان بھی اپنے لئے عار جانتا ہے۔

انہی وقار الملک کا ایک اور واقعہ سننے کے لائق ہے جس سے ان کی مذہبیت کا اندازہ ہوتا ہے، ساتھ ہی ان کی انصاف پسندی اور عدل پروری کا، راوی مولوی بشیر صاحب ہی ہیں فرماتے ہیں:

> وقار الملک نے اپنے لڑکے کو ندوہ میں داخل کرا دیا تھا، میں نے پوچھا کہ آپ نے ندوہ میں کیوں داخل کرا دیا۔ کہنے لگے کچھ مذہبیت آجائے گی، میں نے عرض کیا آپ دوسروں کے لڑکوں کو علی گڑھ بلا کر لامذہب بناتے ہیں چپ ہو گئے۔ لڑکے کو ندوہ سے بلا لیا اور علی گڑھ کالج میں نام لکھا دیا۔

طبیعت کی نیکی اور دل کی سچائی ملاحظہ فرما رہے ہیں۔ خواہ مخواہ بحث شروع نہ کر دی بلکہ وہی کیا جو اس وقت ان کو کرنا چاہیئے تھا۔

ہمارے بابا

[علامہ اسلم جیراجپوری کا علمی پایہ جس قدر بلند تھا، اسی قدر ان کا مرتبہ بہ حیثیت انسان بھی اونچا تھا۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ تھا کہ وہ کسی چھوٹے سے چھوٹے آدمی کو بھی کبھی یہ محسوس نہیں ہونے دیتے تھے کہ وہ اُس سے بلند مرتبت ہیں۔ جب وہ بچوں میں بیٹھتے تو ان کی طبیعت کی سادگی اور سینہ کی کشادگی اپنی پوری وسعتوں کے ساتھ فضا کو گھیر لیتی۔

جامعہ ملیہ (دہلی) سے بچوں کا ایک رسالہ شائع ہوتا ہے "پیام تعلیم"۔ اس کی مارچ ۱۹۵۶ء کی اشاعت میں "ہمارے بابا" کے عنوان سے دو چھوٹے چھوٹے مضمون شائع ہوئے ہیں۔ پہلا مضمون ایک چھوٹی سی بچی عذرا خاتون کا ہے۔ جس میں اس نے اپنے بھولے بھالے انداز میں یہ بتایا ہے کہ علامہ مرحوم بچوں کے ساتھ کس طرح پیش آتے تھے۔ دوسرا مضمون علامہ مرحوم کے پوتے عزیزی شمیم کا ہے۔ جس میں اس نے بتایا ہے کہ علامہ مرحوم جب اپنے وطن تشریف لے جاتے تو بچوں سے کس قدر پیار کرتے۔ ان مضامین سے علامہ مرحوم کی انسانی شخصیت جس انداز سے ابھر کر سامنے آتی ہے۔ ہم قارئین طلوع اسلام کو بھی اس میں شریک کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ چنانچہ یہ دونوں مضامین "پیام تعلیم" (جامعہ نگر۔ دہلی) کے شکریہ کے ساتھ درج ذیل کئے جاتے ہیں۔ عزیزہ عذرا خاتون کے مضمون میں جو واقعہ جنوں کے متعلق بیان ہوا ہے اسے ہم نے بھی علامہ مرحوم کی زبان سے کئی مرتبہ سنا تھا۔ طلوع اسلام]

(۱) ہمارے بابا عذرا خاتون

مولانا اسلم جیراجپوری ہم سب کے بابا، بچوں ہی کے کیا ساری جامعہ کے بابا تھے۔ ہمارا گھر بابا کے گھر سے ملا ہوا تھا۔ بابا وقت کے بڑے پابند تھے۔ ہر کام وقت ہی پر کرتے تھے۔ لیکن ہمارے لئے انھوں نے کبھی پابندی نہیں لگائی۔ جب جی چاہتا ہم بابا کے پاس پہنچ جاتے۔ بابا ہمیشہ ہنس کر ہمارا استقبال کرتے۔ جب ہم بیٹھ جاتے تو ایسی مزے مزے کی باتیں کرتے کہ اٹھنے کو دل ہی نہ چاہتا تھا۔

بابا بڑوں سے تو محبت کرتے تھے۔ لیکن انھیں بچوں سے جتنا لگاؤ تھا اس کی مثال کم ہی مل سکتی ہے۔ بچے بھی بابا کو بہت چاہتے تھے جمعہ کے دن بابا بچوں کو گڑ بلاتے تھے۔ اسی لئے گاؤں کے بچے بابا کو "گڑ والے بابا" کہتے تھے۔ سب بابا کو گھیر کر بیٹھ جاتے۔ اور بابا کے گلے میں

ہاتھ ڈال کر کہانی سننے کے لئے کہتے۔ بابا کہتے۔ "اچھا بھئی میں تمہیں کہانی سناتا ہوں"۔ سب بچے سمٹ کر اکدم بابا کے اور قریب آجاتے۔ بابا کچھ دیر کے لئے سوچتے۔ پھر کوئی اچھی سی کہانی سناتے۔ جب یہ بچے کہانی سن کر چلے جاتے تو ہم لڑکیوں کا غول بابا کے کمرے میں اکٹھا ہو جاتا اب بابا بھی سنبھل کر بیٹھ جاتے اور ہم میں سے کوئی ایک لڑکی بابا کے سر میں تیل ڈال کر دبانے لگتی اور بابا قصے سناتے جاتے۔ برسات کے دنوں میں جب آسمان پر بادل ہوتے تو ہم لوگوں سے کہتے کہ "بھئی لڑکیو تم کسی کام کی نہیں ہو"۔ ہم لوگ کہتے "واہ بابا کیا کام ہے بھلا"۔ کہتے "تم خود نہیں دیکھ رہی ہو کہ آج کتنے بادل ہیں۔ اب ہم بابا کا مطلب سمجھ جاتے اور خوش ہو کر کہتے۔ "تو پھر بابا ہو جائیں پکوڑیاں"! بابا فوراً نوکر کو بلا کر سامنے سامان لانے کے لئے کہہ دیتے۔ اور ہم لوگ انگیٹھی سلگانے اور پیاز وغیرہ کاٹنے کا انتظام کرنے لگتے اور جب پکوڑیاں پک جاتیں تو ہم سب بابا کے ساتھ کھانے بیٹھ جاتے۔ اور بابا ہماری پکوڑیوں کی تعریفوں کے پل باندھنے لگتے"۔ واہ واہ پکوڑیاں بنانا تو کوئی ہماری بیٹیوں سے سیکھے"۔ ہم لوگ خوشی سے پھولے نہ سماتے۔

ایک روز ہم سب بابا کے پاس بیٹھے ہوئے تھے میں نے پوچھا "بابا کیا یہ سچ ہے کہ جن لوگوں کو ستاتے ہیں"۔ کہنے لگے۔ "میں تمہیں ایک واقعہ سناتا ہوں۔ ہمارے گاؤں سے تقریباً دو تین میل دور ایک گاؤں تھا اور چند دنوں سے وہاں یہ مشہور ہو گیا تھا کہ ایک جن آکر لوگوں کو بہت ستانے لگتا ہے۔ ایک دن گاؤں والے وہاں کے ایک مولوی صاحب کے پاس آئے کہا جاتا تھا کہ وہ بہت جلد جن کو اپنے قبضے میں کر لیتے ہیں۔ اس وقت مولوی صاحب میرے پاس بیٹھے تھے۔ گاؤں والے جن کی شکایتیں کرنے لگے مولوی صاحب بولے اچھا کل نو دس بجے رات کے وقت ایک بکرا اور کچھ مٹھائی وغیرہ رکھ دینا۔ دوسرے دن مولوی صاحب سبز لباس پہن کر میرے پاس آئے اور کہنے لگے مولوی صاحب! آپ بھی چلئے اور دیکھئے کہ میں کس طرح جنوں کو بھگاتا ہوں۔ میں بھی راضی ہو گیا جب وہاں پہنچے تو مولوی صاحب نے کچھ اہتمام کیا اور پڑھنے لگے۔ اتنے میں سارے جن بھی آکر جمع ہو گئے اور معافی وغیرہ مانگنے لگے۔ اور کہنے لگے کہ اب اس قسم کی شرارت کبھی نہ کریں گے۔ اور مولوی صاحب بڑی شان سے گاؤں والوں کو بتانے گئے کہ یہ اب کبھی نہ آئیں گے۔ گاؤں والوں نے خوش ہو کر ان کو خوب روپے پیسے دیئے۔ اس کے بعد جب ہم لوگ گھر آنے لگے تو میں نے کہا کہ "کبھی مجھے بھی بتا دو کہ کس طرح جن بھاگ جاتے ہیں۔ مولوی صاحب کہنے لگے کہ اب آپ سے کیا چھپاؤں۔ اصل میں یہ ہمارے ہی گروہ کے کچھ آدمی ہیں جو ایسا کرتے ہیں"۔ میں نے کہا کہ آخر اس میں تم لوگوں کو کیا مزا آتا ہے مولوی صاحب بولے "آخر ہم کو بھی اپنی روزی چلانی ہے" پھر بابا مجھ سے مخاطب ہو کر بولے "ہاں روزی کمانے کے لئے بہت سے جن ہر گاؤں میں ستانے کو مل جائیں گے"۔

جس دن ہم لوگ بابا سے نہ مل پاتے تو اپنے اندر ایک کمی سی محسوس کرتے۔ لیکن آج بابا سے ملے ہوئے تقریباً ایک مہینہ ہو گیا ہے اور ہم بابا سے ملنے کے لئے بے چین ہیں۔ مگر اب موت کے ہاتھوں مجبور ہیں۔ جس نے ہمارے بابا کو ہم سے ہمیشہ کے لئے چھین لیا ہے لیکن بابا کی یاد ہمارے دلوں میں ہمیشہ قائم رہے گی۔ بابا کی کہانیاں اور بابا کی اچھی اچھی باتیں ہمیں بابا کی ہمیشہ یاد دلاتی رہیں گی۔

(۲) ہمارے بابا (محمد شمیم)

پیام تعلیم پڑھنے والے سب ہی بچے "بابا" کو جانتے ہوں گے۔ بہت سے لوگ تو ایسے ہوں گے۔ جنھوں نے انھیں دیکھا بھی ہوگا وہ جامعہ میں استاد تھے۔ انھوں نے جامعہ میں تیس سال سے اوپر مدرسی کی۔ اس لئے بہتوں نے ان سے لکھا پڑھا بھی ہوگا۔ اور میری طرح کچھ ایسے بھی خوش قسمت ہیں جو ان کی گود میں بھی کھیلے ہیں۔ بڑے انھیں "مولانا" کہا کرتے تھے۔ ہمارے اعظم گڈھ کے اطراف کے لوگ انھیں "حافظ جی" کہتے تھے۔ مگر وہ جامعہ کے بچوں اور بڑوں کے بابا تھے۔ اس ایک لفظ میں بڑا پیار تھا۔ جامعہ ان کا گھر تھا اور جامعہ کے لوگ ان کے بیٹے بیٹیاں اور پوتے پوتیاں تھے۔ بابا سب سے محبت کرتے تھے۔ اور بچوں کے لئے تو ان کی محبت روز بروز بڑھتی جاتی تھی۔

میں ان کا پوتا ہوں۔ ہم سب بھائیوں سے انھیں بیحد محبت تھی۔ وہ ہر سال گرمیوں میں چھٹی میں وطن ضرور آتے تھے۔ ان کے آتے ہی ایک ہلچل سی مچ جاتی۔ طرح طرح کی تیاریاں ہوتی تھیں۔ ہم لوگ اچھے اچھے کام کرنا شروع کر دیتے۔ اور خوب محنت سے پڑھتے تھے کیونکہ ہم کو بابا سے اپنے اچھے کام کا انعام بھی تو ملتا تھا۔ جس روز ان کے آنے کا دن ہوتا۔ ہم لوگ گاڑی کے وقت اچھے اچھے کپڑے پہن کر اسٹیشن پہنچتے اور گاڑی کا انتظار کرتے۔ جب گاڑی آتی تو تیسرے درجے کے ڈبے سے ہم کو بابا نظر آتے۔ وہ ہمیں دیکھ کر خوشی سے پھولے نہ سماتے۔ اور ادھر ہمارا یہ حال کہ آسمان سر پر اٹھا لیتے۔ اور جیسے ہی بابا اترے ہم نے انھیں گھیر لیا۔ انھوں نے باری باری سے سب کو پیار کرنا شروع کیا۔ ارے واہ رے بادشاہ شمو واہ! واہ واہ اور وہ مجھے گود میں اٹھا لیتے۔ پھر وہ اجو میاں کی طرف بڑھتے اور انھیں اسی طرح کچھ کہہ کر گود میں اٹھا لیتے اب وہ پھر تے چھوٹے بچوں کا امتحان لیتے۔ اور کہتے۔ "ارے واہ رے میرا جوان واہ۔ ارے اس سال تو کیا ٹیں ٹیں بول رہا ہے اچھا سلو بتاؤ تو میں کون ہوں اور سلو میاں کہتے "بابا" وہ پھر کہتے "نہیں بھائی میرا نام کیا ہے؟ اب سلو کچھ سوچ کر جواب دیتے۔ "آپ تو مولانا اسلم صاحب جیراجپوری ہیں۔" اور یہ سن کر بابا انھیں گود میں چمٹا لیتے اور کہتے اچھا اب گھر چلو تمہارے لئے ایک بہت اچھا کھلونا لایا ہوں۔ ارے شمو میاں تم نے مجھے لکھا تھا کہ تم تو اپنے درجہ میں دوم آئے ہو۔ اچھا ہاں دیکھو میں تمہارے لئے کتنا اچھا قلم لایا ہوں۔ اور ہاں عظیم میاں کے لئے بھی چیزیں ہیں۔ دسو کے لئے گیند ہے۔ وہ بچوں ہی کو نہیں، بچیوں کو بھی اسی طرح پیار کرتے۔ اور انہیں اچھے اچھے خطاب دیتے۔ وہ لڑکیوں کے لئے اکثر "دیولا" کا لفظ استعمال کرتے تھے۔ "ارے میری دیولا شوکت تو اتنی بڑی ہو گئی۔"

گھر پر آتے ہی سب سے پہلے بکس کھلتا تھا۔ ہم سب لوگ ان کے بکس کو گھیر لیتے تھے۔ پہلے تو ان کے کپڑے ہوتے پھر ڈھیر سے کپڑوں کی تہوں کے نیچے سے ہم کو اپنے انعامات نظر آتے تھے۔ اب انعامات بانٹ دیئے جاتے۔ کسی کو گیند، کسی کو چاقو، کسی کو قلم غرض ہر ایک کو کوئی نہ کوئی انعام ملتا۔ لیکن انعامات لینے کے بعد بھی ہم نہ ہٹتے۔ بابا پوچھتے اب کیا چاہیے۔ ہم کہتے "لیمن ڈراپ" بس وہ پیکٹ نکال کر دو دو سب کو تقسیم کرتے تھے۔

وہ دو چار دن تو اعظم گڈھ شہر میں رہتے تھے۔ پھر گھر جانے کا پروگرام بن جاتا۔ گاؤں میں اور زیادہ ہلچل ہوتی۔ کیونکہ وہاں کا ہر بچہ جوان بوڑھا ان کے استقبال کے لئے تیار رہتا۔ بابا ہر ایک سے ہاتھ ملاتے اور ساتھ ساتھ گھر کا حال چال بھی پوچھنا نہ بھولتے تھے بچے تو الگ بیتاب رہتے۔ کوئی کرتے کا دامن کھینچ رہا ہے تو کوئی انگلی پکڑ رہا ہے کوئی ان سے اچھل کر بات کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

گاؤں پر روزانہ صبح سے شام تک آنے والوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ پڑھے لکھے نوجوان بابا سے بڑے بڑے مسئلوں پر باتیں

کرتے تھے۔ دن میں چھوٹے چھوٹے بچے گھیر لیتے اور طرح طرح باتیں ہوتی تھیں۔ بھولی بھولی پیاری پیاری۔ عقل کی کم۔ بیوقوفی کی زیادہ اور بابا ہنس ہنس کر انہیں سنا کرتے تھے۔ شام کو دیہات کے کسانوں کا جمگھٹ رہتا۔ ہل۔ بیل۔ کھیت کھلیانوں، شادی۔ بیاہ اور لڑائی جھگڑے کی باتیں ہوتی تھیں۔ بابا بڑے غور سے سنتے، سمجھاتے اور مشورہ دیتے۔ میں نے آج تک انہیں کسی کو ڈانٹتے نہ دیکھا۔ مغرب کی نماز کے بعد سے عشاء تک عورتیں آنا شروع کر دیتیں۔ نماز۔ روزہ۔ جنت۔ دوزخ اور خدا رسول کی باتیں۔ شادی بیاہ۔ لڑائی جھگڑے۔ پیر فقیر غرض دنیا بھر کی باتیں ہوتیں۔ بابا ہر ایک کو اچھی طرح سمجھا سمجھا کر جواب دیتے۔ میری طبیعت کبھی کبھی جھلا جاتی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ دروازہ بند کر دوں اور کسی کو آنے نہ دوں۔ ہر روز وہی بات۔ مگر بابا کبھی نہ گھبراتے۔ وہ ٹھنڈے دل سے ہر بات کا جواب دیتے۔ بوڑھیاں سنتی کم تھیں۔ مگر گرذمیں زیادہ جاتی تھیں۔

کبھی کبھی ایک خاص پروگرام بھی ہوتا تھا۔ اس دن گاؤں کی ہر لڑکی گھر پر موجود ہوتی تھی۔ ایک بہت بڑا سا احاطہ ہے۔ لڑکیاں اسی میں چولھے جلا لیتیں۔ کوئی روٹی پکا رہی ہے۔ تو کوئی پکوڑیاں، کوئی پوریاں تو کوئی سالن اور گوشت۔ کوئی چائے بنا رہی ہے۔ لڑکیاں تو اپنے کام میں لگی رہتیں اور بابا گھوم پھر کر ہر ایک کے پاس جاتے: "اچھا سلمیٰ رانی پکوڑیاں پکا رہی ہیں۔ واہ واہ کتنی اچھی ہیں۔ ارے یہ تو گھر کی رانی ہے۔ اپنے گھر جا کر یہ رانی بنے گی رانی"۔ شوکت کے پاس آتے تو اس کی چائے کی تعریف کرتے۔ کسی اور کے پاس جاتے تو اس کی پکائی ہوئی چیز کی طرح طرح سے تعریف کرتے۔ اور ان کے دل بڑھاتے۔ یہ تو صرف دیکھ دیکھ کر تعریف تھی۔ جب سب چیزیں پک کر تیار ہو جاتیں تو سب کا نمونہ بابا کے پاس آجاتا۔ ہم لوگ بھی پاس ہی بیٹھ جاتے۔ بابا ایک ایک چیز کھاتے اور ایسی ایسی تعریف کرتے اور ایسی ایسی دعائیں دیتے کہ بس کچھ نہ پوچھئے۔ منہ سے رال ٹپکنے لگے گی۔ بعض لڑکیاں اتنا خراب پکاتیں کہ منہ کا مزا خراب ہو جاتا تھا۔ مگر بابا مزے لے لے کر کھاتے جاتے اور تعریف کرتے جاتے تھے۔ ایک دن امتحان لینے کے لئے تمام لڑکوں کو جمع کرتے اور سب سے کہتے کہ آج سب لوگ اپنی اپنی بنسی تیار کریں۔ تالاب چلیں گے اور مچھلیوں کا شکار کریں گے۔ جب ہم لوگ اپنی اپنی بنسی لیکر آجاتے تو وہ ہم سب کو لیکر چلتے۔ راستہ بھر ترکیبیں بتلاتے۔ تالاب پر پہنچ کر ہم سب لوگ پانی میں ڈور ڈال کر مچھلی کا انتظار کرتے۔ بابا باری باری سب کے پاس جاتے ہر ایک کی شکار کی ہوئی مچھلی دیکھتے۔ پیٹھ ٹھونکتے۔ تعریف کرتے۔ اگر شکار کرنے میں کوئی غلطی ہوتی تو وہ اسے بتلاتے۔ وہ لاتے ہی پر بس نہ کرتے جو لڑکا سب سے زیادہ اور بڑی مچھلیاں پھنسا لاتے انعام بھی دیتے تھے۔ وہ صرف مچھلیوں کے شکار میں ہی حصہ نہ لیتے تھے بلکہ ہمارے گاؤں کی زندگی کے کھیل سے بھی بڑی دلچسپی لیتے۔ وہ اس میں خود بھی حصہ لیتے۔ اسی طرح ہنسی کھیل میں ہی ہماری گرمیوں کی چھٹیاں ختم ہو جاتی تھیں۔ ہم لوگ اعظم گڈھ چلے جاتے اور بابا دہلی چلے جاتے۔ اور پھر ہم سے دس مہینے کے لئے الگ ہو جاتے تھے اور وہاں سے ہم ان کے اچھے اچھے خط ملتے۔ جس میں بابا ہمارے لئے بڑی کام کی باتیں لکھتے اور پھر ہم گرمیوں کی چھٹیوں کا انتظار کرتے تھے اور سوچتے تھے کہ اے کاش یہ چھٹیاں کبھی ختم نہ ہوں۔ یہ ان کا رویہ تو اپنے گاؤں والوں اور بچوں کے ساتھ تھا۔ لیکن وہ سب ہی سے محبت کرتے تھے نوکروں کی بہت عزت کرتے تھے۔ کسی کو شاید ہی کبھی ڈانٹا ہو۔ جھوٹ اور وعدہ خلافی سے انہیں چڑ تھی۔ قرض لینے اور دینے کو برا سمجھتے تھے۔

انہوں نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں، جو کچھ تو مذہبی ہیں اور کچھ تاریخی۔ انہیں کتابوں کی وجہ سے وہ بہت مشہور تھے۔ مگر وہ ہمارے تو صرف بابا تھے ایک محبت کا دریا اور پیار کا سمندر اور دسمبر کی ۸ تاریخ کو وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ بابا کی آخری آرام گاہ جامعہ ہی ہے جن بچوں کے ساتھ وہ زندگی میں تھے مرنے کے بعد بھی انہوں نے ان کا پڑوس نہ چھوڑا۔

پاکستان کا دستور منظور ہو گیا

لیکن کیا ہماری مجلس دستور ساز کا منظور کردہ دستور قرآنی تعلیمات کے ان تقاضوں کو پورا کر دیتا ہے جن کا خواب ہم نے قیام پاکستان کی جدوجہد کے سلسلہ میں دیکھا تھا!

اس کے جواب کے لئے دستوری سلسلہ میں ادارۂ طلوع اسلام کی طرف سے شائع کردہ کتابوں

اسلامی نظام اور قرآنی دستور پاکستان

کا مطالعہ از بس ضروری ہے

اسلامی نظام میں اسلامی مملکت کے بنیادی اصول بتائے گئے ہیں۔ نیز یہ کہ اسلامی نظام کیسے قائم ہو سکتا ہے۔ کتاب محترم پرویز صاحب اور علامہ اسلم جیراجپوریؒ کے بلند پایہ مقالات پر مشتمل ہے۔ جنہوں نے فکر و نظر کی نئی راہیں کھول دی ہیں۔ ۱۸۰ صفحات۔ قیمت صرف دو روپے۔ اور

قرآنی دستور پاکستان میں پاکستان کے لئے قرآنی دستور کا خاکہ دیا گیا ہے، حکومت، علماء اور جماعت اسلامی کے مجوزہ دستوروں پر تنقید کی گئی ہے۔ ۲۲۴ صفحات۔ قیمت صرف دو روپے آٹھ آنے۔

لیکن کتابوں کی اہمیت اور وقت کی ضرورت کا لحاظ کرتے ہوئے ادارہ کی طرف سے دونوں کتابیں یکجا خریدنے پر

خصوصی رعایت

کا اعلان کیا جاتا ہے یعنی بجائے ساڑھے چار روپے علاوہ محصول ڈاک کے دونوں کتابیں مع محصول ڈاک صرف تین روپے میں پیش کر دی جائیں گی۔

ناظم ادارۂ طلوع اسلام
۱۵۹/۳۔ ایل۔ پی۔ ای۔ سی۔ ایچ سوسائٹی کراچی

قرآنی انقلاب کا لٹریچر

معراجِ انسانیت از:- پرویز
سیرتِ صاحبِ قرآن علیہ التحیۃ والسلام کو قرآن کے آئینے میں دیکھنے کی پہلی اور کامیاب کوشش۔ مذاہبِ عالم کی تاریخ اور تہذیبی پس منظر کے ساتھ ساتھ حضور سرورِ کائنات کی سیرتِ درخشندہ کے متنوع گوشے نکھر کر سامنے آگئے ہیں۔ بڑے سائز کے قریباً نو سو صفحات۔ اعلیٰ ولایتی گلیز کاغذ۔ مضبوط و حسین جلد مع گردپوش۔ قیمت۔۔ بیس روپے

ابلیس و آدم از:- پرویز
سلسلہ معارف القرآن کی پہلی جلد جسے نظرثانی کے بعد شائع کیا گیا ہے۔ انسانی تخلیق۔ تا آدم جنات ملائکہ۔ وحی وغیرہ جیسے اہم مباحث کی حامل۔ بڑی تقطیع کے ۳۷۶ صفحات۔ قیمت آٹھ روپے

جوئے نور از:- پرویز
سلسلہ معارف القرآن کی دوسری کڑی۔ جو حضرات انبیائے کرام کے تذکارِ جلیلہ پر مشتمل ہے جس میں حضرت نوحؑ سے لے کر حضرت شعیبؑ تک تمام انبیائے کرام علیہم التحیۃ والسلام کا تذکرہ آگیا ہے۔ سائز ۲۲x۲۹/۸ ضخامت ۴۰۲۔ قیمت مجلد مع گردپوش چھ روپے۔

انسان نے کیا سوچا؟ از:- پرویز
فکرِ انسانی کی آج تک کی تاریخ کہ اس نے اپنی مشکلات و مسائل کو حل کرنے کیلئے آج تک کیا سوچا۔ محترم پرویز صاحب کی بلند پایہ تصنیف۔ سائز ۲۲x۲۹/۸ ضخامت ۳۶۸ صفحات۔ قیمت مجلد مع گردپوش دس روپے۔

سلیم کے نام از:- پرویز
نوجوانوں کے دل میں اسلام سے متعلق جو شکوک پیدا ہوتے ہیں۔ ان کا شگفتہ اور مدلل جواب۔ بڑے سائز کے ۴۰۸ صفحات۔ قیمت چھ روپے

تاریخ الامت
علامہ اسلم جیراجپوریؒ کی تاریخ کی وہ بے مثل کتاب جو تقسیم سے پہلے بیشتر درسگاہوں میں بطور نصاب شامل تھی۔ اب مولف کی اجازت سے طلوعِ اسلام کے لئے دوبارہ چھاپا ہے۔ قیمت حصہ اول دو روپے۔ حصہ دوم دو روپے آٹھ آنے۔ حصہ سوم دو روپے۔ حصہ چہارم دو روپے آٹھ آنے۔ کتاب آٹھ حصوں پر مشتمل ہے۔ باقی حصے عنقریب شائع ہو جائیں گے
محصولڈاک ہر حالت میں بذمہ خریدار)

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۱۵۹/۳۔ ایل۔ پی۔ ای۔ سی۔ ایچ سوسائٹی کراچی